السلام علی الحسین و علی علی بن الحسین و علی اولاد الحسین و علی اصحاب الحسین

مجله علمی و تحقیقاتی

اختر تابان

محرم الحرام و صفر المظفر ۱۴۴۲ھ

بنیاد اختر تابان

www.allamahrizvi.com

يَا أَبَا عَبْدِ الله صَلَّى اللهُ عَلَيْكَ

زيارت اربعين

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ السَّلامُ عَلَى وَلِيِّ اللهِ وَ حَبِيبِهِ السَّلامُ عَلَى خَلِيلِ اللهِ وَ نَجِيبِهِ السَّلامُ عَلَى صَفِيِّ اللهِ وَ ابْنِ صَفِيِّهِ السَّلامُ عَلَى الْحُسَيْنِ الْمَظْلُومِ الشَّهِيدِ السَّلامُ عَلَى أَسِيرِ الْكُرُبَاتِ وَ قَتِيلِ الْعَبَرَاتِ اللَّهُمَّ إِنِّي أَشْهَدُ أَنَّهُ وَلِيُّكَ وَ ابْنُ وَلِيِّكَ وَ صَفِيُّكَ وَ ابْنُ صَفِيِّكَ الْفَائِزُ بِكَرَامَتِكَ أَكْرَمْتَهُ بِالشَّهَادَةِ وَ حَبَوْتَهُ بِالسَّعَادَةِ وَ اجْتَبَيْتَهُ بِطِيبِ الْوِلادَةِ وَ جَعَلْتَهُ سَيِّداً مِنَ السَّادَةِ وَ قَائِداً مِنَ الْقَادَةِ وَ ذَائِداً مِنَ الذَّادَةِ وَ أَعْطَيْتَهُ مَوَارِيثَ الْأَنْبِيَاءِ وَ جَعَلْتَهُ حُجَّةً عَلَى خَلْقِكَ مِنَ الْأَوْصِيَاءِ فَأَعْذَرَ فِي الدُّعَاءِ وَ مَنَحَ النُّصْحَ وَ بَذَلَ مُهْجَتَهُ فِيكَ لِيَسْتَنْقِذَ عِبَادَكَ مِنَ الْجَهَالَةِ وَ حَيْرَةِ الضَّلالَةِ وَ قَدْ تَوَازَرَ عَلَيْهِ مَنْ غَرَّتْهُ الدُّنْيَا وَ بَاعَ حَظَّهُ بِالْأَرْذَلِ الْأَدْنَى وَ شَرَى آخِرَتَهُ بِالثَّمَنِ الْأَوْكَسِ وَ تَغَطْرَسَ وَ تَرَدَّى فِي هَوَاهُ وَ أَسْخَطَكَ وَ أَسْخَطَ نَبِيَّكَ ، وَ أَطَاعَ مِنْ عِبَادِكَ أَهْلَ الشِّقَاقِ وَ النِّفَاقِ وَ حَمَلَةَ الْأَوْزَارِ الْمُسْتَوْجِبِينَ النَّارَ {لِلنَّارِ} فَجَاهَدَهُمْ فِيكَ صَابِراً مُحْتَسِباً حَتَّى سُفِكَ فِي طَاعَتِكَ دَمُهُ وَ اسْتُبِيحَ حَرِيمُهُ اللَّهُمَّ فَالْعَنْهُمْ لَعْناً وَبِيلاً وَ عَذِّبْهُمْ عَذَاباً أَلِيماً السَّلامُ عَلَيْكَ يَا ابْنَ رَسُولِ اللهِ السَّلامُ عَلَيْكَ يَا ابْنَ سَيِّدِ الْأَوْصِيَاءِ أَشْهَدُ أَنَّكَ أَمِينُ اللهِ وَ ابْنُ أَمِينِهِ عِشْتَ سَعِيداً وَ مَضَيْتَ حَمِيداً وَ مُتَّ فَقِيداً مَظْلُوماً شَهِيداً وَ أَشْهَدُ أَنَّ اللهَ مُنْجِزٌ مَا وَعَدَكَ وَ مُهْلِكٌ مَنْ خَذَلَكَ وَ مُعَذِّبٌ مَنْ قَتَلَكَ وَ أَشْهَدُ أَنَّكَ وَفَيْتَ بِعَهْدِ اللهِ وَ جَاهَدْتَ فِي سَبِيلِهِ حَتَّى أَتَاكَ الْيَقِينُ فَلَعَنَ اللهُ مَنْ قَتَلَكَ وَ لَعَنَ اللهُ مَنْ ظَلَمَكَ وَ لَعَنَ اللهُ أُمَّةً سَمِعَتْ بِذَلِكَ فَرَضِيَتْ بِهِ، اللَّهُمَّ إِنِّي أُشْهِدُكَ أَنِّي وَلِيٌّ لِمَنْ وَالاهُ وَ عَدُوٌّ لِمَنْ عَادَاهُ بِأَبِي أَنْتَ وَ أُمِّي يَا ابْنَ رَسُولِ اللهِ أَشْهَدُ أَنَّكَ كُنْتَ نُوراً فِي الْأَصْلابِ الشَّامِخَةِ وَ الْأَرْحَامِ الْمُطَهَّرَةِ {الطَّاهِرَةِ} لَمْ تُنَجِّسْكَ الْجَاهِلِيَّةُ بِأَنْجَاسِهَا وَ لَمْ تُلْبِسْكَ الْمُدْلَهِمَّاتُ مِنْ ثِيَابِهَا وَ أَشْهَدُ أَنَّكَ مِنْ دَعَائِمِ الدِّينِ وَ أَرْكَانِ الْمُسْلِمِينَ وَ مَعْقِلِ الْمُؤْمِنِينَ وَ أَشْهَدُ أَنَّكَ الْإِمَامُ الْبَرُّ التَّقِيُّ الرَّضِيُّ الزَّكِيُّ الْهَادِي الْمَهْدِيُّ وَ أَشْهَدُ أَنَّ الْأَئِمَّةَ مِنْ وُلْدِكَ كَلِمَةُ التَّقْوَى وَ أَعْلامُ الْهُدَى وَ الْعُرْوَةُ الْوُثْقَى وَ الْحُجَّةُ عَلَى أَهْلِ الدُّنْيَا وَ أَشْهَدُ أَنِّي بِكُمْ مُؤْمِنٌ وَ بِإِيَابِكُمْ مُوقِنٌ بِشَرَائِعِ دِينِي وَ خَوَاتِيمِ عَمَلِي وَ قَلْبِي لِقَلْبِكُمْ سِلْمٌ وَ أَمْرِي لِأَمْرِكُمْ مُتَّبِعٌ وَ نُصْرَتِي لَكُمْ مُعَدَّةٌ حَتَّى يَأْذَنَ اللهُ لَكُمْ فَمَعَكُمْ مَعَكُمْ لا مَعَ عَدُوِّكُمْ صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيْكُمْ وَ عَلَى أَرْوَاحِكُمْ وَ أَجْسَادِكُمْ {أَجْسَامِكُمْ} وَ شَاهِدِكُمْ وَ غَائِبِكُمْ وَ ظَاهِرِكُمْ وَ بَاطِنِكُمْ آمِينَ رَبَّ الْعَالَمِينَ.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زیر سرپرستی حضرت ولیعصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف

دوماہی مجلہ علمی و تحقیقاتی اختر تابان

سال ۲ | شمارہ ۷ | محرم الحرام و صفر المظفر ۱۴۴۷ھ

مشخصات مجلّہ

ناظر اعلیٰ
حجۃ الاسلام والمسلمین سید کاظم رضوی

مدیر اجرائی
مولانا سید تعلیم رضا جعفری

معاون اجرائی
ڈاکٹر سید باقر ایلیار رضوی

گرافیک و ڈیزائن
سید روح اللہ نقوی

بنیاد اختر تابان

خیابان صفائیہ، کوچہ ۲۸، چہار راہ اول، پلاک ۶۳

+۹۸۹۹۶۳۷۷۸۶۱۴ - ۰۲۵۳۷۸۳۷۵۰۶

www.AllamahRizvi.com

info@allamahrizvi.com

اہل قلم حضرات سے مفید مقالات ارسال فرمانے کی گزارش ہے۔

البتہ مقالہ نگار کی آراء سے ادارہ کا اتفاق ضروری نہیں ہے۔

فہرست مطالب

- حق پرستوں کا قافلہ — ۴
  اداریہ
- نفس مطمئن — ۵
  آیت کا پیغام
- تحریک عاشوراء کی خصوصیات اور مقصد حسینی — ۸

  حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای (مدظلہ العالی) کے بیانات کی روشنی میں
- حفاظت اسلام میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا کردار — ۱۷

  رئیس المبلغین علامہ سید سعید اختر رضوی گوپالپوری (اعلی اللہ مقامہ)
- اصحاب اور اہل بیت حسینیؑ؛ معیار فضائل انسانی — ۳۶

  مولانا سید کاظم رضوی
- عزاداری کا عبادی اور جہادی پہلو آیۃ اللہ جوادی آملی کی نظر میں — ۳۹

  ڈاکٹر باقر ایلیار رضوی
- مقصد عزائے امام حسینؑ — ۴۴

  مولانا عابد رضا نوشاد رضوی
- قرآن، امام حسینؑ اور امام مہدیؑ میں باہمی ارتباط — ۵۱

  مولانا سید تعلیم رضا جعفری
- شب عاشور کی مہلت اور حکمتیں — ۶۱

  مولانا سید محمد مجتبیٰ علی رضوی
- آئینۂ کربلا میں خوبصورتی کی علامات — ۶۹

  سیدہ نہاں نقوی
- کربلا میں ظلم و تشدد کی جڑیں — ۷۶

  مولانا محمد علی
- کربلا شام و سحر جانے کو جی چاہتا ہے — ۸۱

  مولانا عرفان عالم پوری
- نذرانہ عقیدت در بارۂ شہیدان کربلاؑ — ۸۲

  مولانا شفیع بنارسی
- کتاب اربعین — ۸۳

  مولانا حسن رضا
- HOW IMAM HASAN AND IMAM HUSAYN (A.S) SAVED ISLAM FROM DESTRUCTION — ۸۶
  RAIS AL-MUBALLIGHEEN ALLAMAH SAYYID SAEED AKHTAR RIZVI

اداریہ: حق پرستوں کا قافلہ

امامِ عالی مقام، سرورِ شہیدان، حضرت امام حسینؑ ابن علیؑ کا عظیم قافلہ، تاریخِ انسانی کا وہ روشن باب ہے جو ہر دور میں حق و صداقت کے متلاشیوں کے لیے مشعلِ راہ بنا رہے گا۔ یہ قافلہ محض ایک جغرافیائی سفر نہ تھا، بلکہ امتِ اسلامیہ کی بنیادی اصلاح اور دینِ محمدیؐ کی حقیقی تجدید کا عظیم الشان تحریک تھا۔جب امت پر ظلم و جور کی تاریکیاں چھانے لگیں، دین کی اصل شکل مسخ ہونے لگی، اور حکمرانوں نے اسلام کو اپنی ہوسِ قدرت کا آلہ بنالیا، تو امام حسینؑ نے اعلان فرمایا: «إنّی لَمْ أَخْرُجْ أَشِراً وَ لا بَطِراً، إنَّما خَرَجْتُ لِطَلَبِ الإصْلاحِ فی أُمَّةِ جَدِّی»؛ "میں نہ سرکشی کے لیے نکلا ہوں نہ فساد برپا کرنے کے لیے۔ میں صرف اپنے نانا (رسول اللہؐ) کی امت کی اصلاح کے لیے نکلا ہوں"۔ آپؑ کا قیام، منکر کے مقابلے میں امر بالمعروف کی زندہ مثال تھا۔ آپؑ نے ثابت کیا کہ جب دین کے اصولوں پر کاری ضرب لگے، تو خاموش تماشائی بنے رہنا بذاتِ خود گناہ ہے۔ آپؑ کی اصلاحی تحریک کا عنوان یہی "حیاتِ دین" تھا۔ آپؑ نے اپنی اور اہلِ بیتؑ کی قربانی دے کر یہ سبق دیا کہ حق کی سربلندی باطل کی کثرت سے نہیں ٹکتی۔ ایمان کی حفاظت جان سے عزیز تر ہوتی ہے اور اصلاحِ امت کی ذمہ داری ہر صاحبِ ایمان پر عائد ہوتی ہے۔

"حق پرستوں کا قافلہ" آج بھی رُکا نہیں ہے۔ یہ ہر اس فرد، گروہ اور تحریک کا نام ہے جو ظلم کے آگے سینہ تان کر کھڑا ہو۔ باطل کے جبر پر "نَا" کہنے کی ہمت رکھے۔ دینِ حق کی سربلندی اور معاشرے کی اخلاقی و روحانی اصلاح کے لئے اپنا وجود وقف کر دے۔ امام حسینؑ کی یہ اصلاحی جدوجہد ہمیں یہ پیغام دیتی ہے کہ خاموشی اور مصلحت پرستی ظلم کی تائید ہے۔ حق پر قائم رہنا ہی حقیقی کامیابی ہے اور امت کی فلاح، اصولوں پر سمجھوتہ کیے بغیر جدوجہد سے ہی ممکن ہے۔ آیئے، ہم بھی اس پاکیزہ قافلے کا حصہ بنیں۔ اپنے اندر وہ جرأت، وہ استقامت اور وہ شعور بیدار کریں جس مطالبہ دین ہم سے کرتا رہا ہے۔ اپنے گھروں، معاشروں اور شہروں میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے فریضہ کو زندہ کریں؛ اس لئے کہ قرآن کا ارشاد گرامی ہے کہ: «كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ»؛ «تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی رہنمائی) کے لیے میدان میں لائی گئی ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو»۔ (آل عمران: ۱۱۰)۔ حق پرستوں کا قافلہ چل پڑا ہے۔ سچائی کے متوالو! تم بھی اٹھ کھڑے ہو۔

آیت کا پیغام؛ نفس مطمئن

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: "يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي" (سورۂ فجر۔ آیات ۲۷-۲۹)؛ اے نفس مطمئن! تُو اپنے رب کی طرف لوٹ آ، اس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ پس تُو میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا۔ اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

یہ چند مختصر الفاظ ایک مکمل اور زندہ جاوید پیغامِ حیات سمیٹے ہوئے ہیں، جو انسان کی حتمی کامیابی اور ابدی سعادت کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ ان آیات کا مرکز و محور "نفس مطمئن" ہے۔ "نفس مطمئن" وہ جان ہے جسے دنیا کی ہر آزمائش، ہر پریشانی، ہر خوشی اور ہر غم کے باوجود گہرا، مستقل اور حقیقی سکون حاصل ہو گیا ہے۔ یہ سکون مال و دولت، منصب و حشمت یا دنیاوی کامیابیوں سے نہیں، بلکہ اپنے خالق و مالک کے ساتھ مضبوط اور گہرے تعلق (ایمان)، اس پر پختہ بھروسے (توکل) اور اس کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دینے (رضا) سے ملتا ہے۔ یہ دل کا وہ سکون ہے جو ہر حال میں قائم رہتا ہے۔

نفس مطمئن کا مقصدِ زندگی صرف اور صرف اللہ کی رضا حاصل کرنا ہوتا ہے۔ وہ ہر عمل، ہر قربانی، ہر مشکل کو اسی لیے برداشت کرتا ہے کہ اس کا رب خوش ہو جائے۔ اسے دنیا کی ناپسندیدگی یا لوگوں کی نارضایتی کا خوف نہیں ہوتا، بس اللہ کی خوشنودی کا خیال اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔

نفس مطمئن کا ایمان اتنا پختہ اور یقین اتنا کامل ہوتا ہے کہ اس کے دل میں اللہ، آخرت، حساب و کتاب، جنت و دوزخ یا تقدیر کے بارے میں کوئی شک و شبہ یا تردد نہیں ہوتا۔ اس کا دل "اطمینان" کی حقیقی کیفیت سے سرشار ہوتا ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی حقیقت "موت" کا خوف عام انسانوں کو گھیرے رہتا ہے۔ لیکن نفس مطمئن کے لیے موت خوف کی چیز نہیں، بلکہ اپنے محبوب حقیقی سے جا ملنے کا راستہ ہے۔ وہ موت کو "اپنے رب کی طرف لوٹنا" سمجھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نفس مطمئن کو جس شاندار استقبال اور بے مثال انعامات سے نوازتا ہے، وہ اس کی عظمت کو واضح کر دیتے ہیں: سب سے پہلے رب کی طرف سے نہایت محبت اور تکریم سے بھرا ہوا خطاب ہوتا ہے کہ: "يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ" (اے اطمینان والے نفس!)۔ یہ خطاب خود اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کو اس کا نفس کو بہت پسند ہے، اس کی قدر و تکریم کرتا ہے۔ اس کے بعد پھر فرماتا ہے: "ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ" (اپنے رب کی طرف لوٹ آ)۔ یہ لوٹنا عزت اور سعادت کے ساتھ ہے، کسی طرح کی ذلت اور خوف کا شائبہ نہیں ہے۔

اسی طرح دونوں طرف سے رضایت و خشنودی کی منزل ہوتی ہے؛ اسی وجہ سے کامیابی کی سب سے بڑی علامت یہ بتائی گئی کہ: "رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً" (تو مجھ سے راضی اور میں تجھ سے راضی ہوں)۔ یعنی نفس مطمئن وہ ہے جس نے اپنی زندگی، اپنی تقدیر، اپنے رب کے ہر فیصلے سے مکمل رضامندی کا اظہار کیا۔ اس سے کسی طرح کا کوئی گلہ شکوہ نہیں، کوئی افسوس نہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی اس کے ایمان، اعمال، صبر، توکل اور رضا پر اس سے خوش ہے۔ رب کی یہ رضا ہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

نفس مطمئن کا اعزاز صرف جنت ہی میں داخلہ نہیں ہے بلکہ پہلے ایک بہت بڑے اعزاز سے نوازا جاتا ہے: "فَادْخُلِي فِي عِبَادِي" (پس تُو میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا)۔ یہ "عبادی" (میرے بندے) عام مومنین نہیں، بلکہ وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جن کی مثال پیغمبر، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔ نفس مطمئن کو ان کے صف میں کھڑا ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

اعزاز کے ساتھ "وَادْخُلِي جَنَّتِي" (اور میری جنت میں داخل ہو جا)۔ یہ صرف ظاہری و عمومی جنت نہیں ہے بلکہ "میری جنت" ہے۔ اس میں الفت، قربت اور خصوصی تعلق کا اعلان ہے۔ یہ وہ جنت ہے جس کی نعمتیں آنکھوں نے نہ دیکھیں، کانوں نے نہ سنیں اور نہ ہی کسی انسان کے دل پر ان کا تصور گزرا۔ یہ ابدی سکون، مسرت اور نعمتوں کا گھر ہے۔

خلاصہ یہ کہ سورۂ فجر کی یہ آیات ہر انسان کے سامنے زندگی کا ایک واضح اور تابناک ہدف پیش کرتی ہیں کہ اپنے نفس کو "نفس مطمئن" بنایا جائے اور یہ ہدف دنیاوی مال و متاع، شہرت یا طاقت حاصل کرنے سے کہیں بلند اور پائیدار ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایمان کو پختہ کیا جائے۔ ہر حال میں اللہ پر بھروسہ رکھا جائے، اس کے ہر فیصلے پر راضی اور نیک اعمال کو اپنا شعار بنانے کی پوری کوشش کی جائے اور ہمیشہ منزل کمال کی طرف گامزن رہتے ہوئے آخرت کی تیاری میں لگے رہنا چاہئے۔

یہ آیات موت کے بعد کی زندگی کو حقیقی اور تابناک زندگی ثابت کرتی ہیں، جہاں حقیقی کامیابی "نفس مطمئن" ہی کے حصے میں آتی ہے۔ اسی طرح یہ آیات مایوسی اور پریشانی کے لمحات میں امید کی کرن ہیں۔ جو بندہ اپنے رب سے راضی ہو کر دنیا سے جاتا ہے، اس کا انجام یقیناً بہترین ہوگا۔

حضرت امام حسینؑ نے کربلا کے میدان میں "نفس مطمئن" کی وہ عملی تصویر پیش کی جس کا قرآن ذکر کرتا ہے۔ اسی لئے آپ کو "سورہ الفجر" کو "سورہ حسینؑ" بھی بیان کیا گیا ہے (مجمع البیان، ج۹و۱۰)۔ آپؑ نے تنہائی، پیاس، عزیزوں کی شہادت اور دشمن کی بے رحمی کے باوجود اپنے رب پر پورا یقین قائم رکھا۔ دعائے عرفہ میں فرماتے ہیں: "وخيّرلي في قضائك و

بارک لي في قدري حتى لا أحب تعجيل ما أخرت و لا تأخير ما عجلت"؛ اپنے فیصلے کو میرے لئے خیر و بہتر بنادے اور میری تقدیر میں برکت عطا فرما تاکہ میں نہ تو تیری جانب سے مؤخر کی گئی چیز میں جلدی چاہوں اور نہ ہی جلد ملنے والی چیز کے بارے میں تاخیر کو پسند کروں"(مفاتیح الجنان)۔

اسی کربلا کے میدان میں آخری وقت بھی یہی دعا فرمارہے تھے کہ"**رضا بقضائک و تسلیما لأمرک و لا معبود سواک یا غیاث المستغیثین**"؛ خدایا! میں تیری قضا پر راضی اور تیرے امر کے سامنے تسلیم ہوں، تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اے فریاد کرنے والے کے مددگار (مقتل الحسینؑ، ابی مخنف، ص ۱۳۲)۔ معلوم ہوا ہے کہ امام حسینؑ آیاتِ فجر کا عین مظہر تھے۔ اسی طرح حضرت امام حسینؑ کا یہ اعلان"**هيهات من الذلة**"(ہم ذلت کو ہرگز قبول نہیں کرتے!)۔ بھی رضائے الٰہی سے سرشار ہونے کی نشانی تھا اور اسی وجہ سے دنیا کی کوئی طاقت آپؑ کو جھکا نہ سکی۔ اور آخر کار آپؑ کی عظیم قربانی نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ صاحب"نفس مطمئن"صرف اللہ کی خوشنودی کو اپنا معیار بناتا ہے۔

روزِ عاشورا جب امامؑ کے ساتھیوں نے شہادت پیش کی تو ہر ایک کا آخری جملہ بھی یہی تھا کہ بس اللہ ہم سے راضی رہے۔ یہ پختہ یقین ہی"اطمینانِ قلب"کی اصل بنیاد ہے۔ جب حضرت امام حسینؑ کی پاک روح آسمان کی جانب پرواز کرنے لگی تو انہیں آیات کی صدا بلند ہوئی کہ"**يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ**..."اے نفس مطمئن اپنے پروردگار کی جانب لوٹ آ....

پروردگار عالم سے دعا ہے کہ خدایا! ہمارے دلوں کو ایمان اور یقین سے منور فرما۔ ہر آزمائش میں ہمیں صبر اور توکل عطا فرما۔ اپنی رضا پر راضی رہنے کی توفیق دے۔ ہمارے نفسوں کو"نفس مطمئن"بنادے، تاکہ تیرے بلند ترین مقام پر ہم بھی تیرے محبوب بندوں میں شامل ہو سکیں اور تیری رضا اور تیری جنت کے حقدار قرار پائیں۔(آمین یارب العالمین)۔

تحریک عاشوراء کی خصوصیات اور مقصد حسینی

▪ حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای (مدظلہ العالی) کے بیانات کی روشنی میں

نوٹ: مندرجہ ذیل تحریر حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای (مدظلہ العالی) کے بیانات و خطبات سے اقتباس ہیں جو آپ کے آثار سے متعلق ویب سائٹ (www.khamenei.ir) پر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ (ادارہ)

تمہید

عاشور کا واقعہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ یہ محض تاریخی واقعہ نہیں تھا، یہ واقعہ امت اسلام کے لئے ایک ثقافت، ایک دائمی تحریک اور ابدی قابل تقلید نمونے کا سرآغاز تھا (۲۵ جنوری ۲۰۰۶)۔ حقیقت یہ ہے کہ حسینؑ ابن علیؑ نے اپنے جہاد کی برکت سے اسلام کو نئی زندگی دی (۲۴ مئی ۱۹۹۵)۔ ایسا واقعہ منفرد خصوصیات اور اوصاف کا حامل ہے جو اسے تاریخ کے دیگر واقعات اور انقلابات سے ممتاز بناتے ہیں اور اسی وجہ سے عاشور کے قیام نے اسلام کی تقدیر سنوارنے اور اس کی حفاظت میں بڑا بنیادی کردار ادا کیا۔

تحریک عاشوراء کی اہم خصوصیات

تحریک عاشوراء کی متعدد خصوصیات میں سے بعض حسب ذیل ہیں؛

۱۔ اخلاص

قیام حسینی کی اہم ترین خصوصیات میں سے ایک اخلاص ہے۔ حسینؑ ابن علیؑ کی تحریک صرف اور صرف، خالصتا اللہ کے لئے، دین کے لئے اور مسلمانوں کی اصلاح کے لئے تھی، اس میں کسی طرح کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ یہ جو حسین ابن علیؑ نے فرمایا: «**انّی لم اخرج اشراً و لابطراً و لاظالماً و لامفسداً**» یہ خود نمائی نہیں ہے، اپنا لوہا منوانا مقصد نہیں ہے، اپنے لئے نہیں، کسی چیز کی طلب کے لئے نہیں، نمائش کے لئے نہیں۔ ذرہ برابر ستم اور فساد اس تحریک میں نہیں ہے۔ «**و انما خرجتُ لطلب الاصلاح فی امّة جدّی**» یہ بڑا کلیدی نکتہ ہے۔ انّما: بس یہی، یعنی کوئی دوسرا ہدف و مقصد اس پاکیزہ نیت، آفتاب کی مانند جگمگاتے ذہن کو مکدر نہیں کر سکتا (۱۶ جنوری ۱۹۹۴)۔

یہی اخلاص امام حسینؑ کے قیام کی ابدیت کا ضامن ہے؛ امام حسینؑ کا عمل ایسا ہے جس میں سوئی

کی نوک کے برابر بھی کسی اور نیت کی آمیزش نہیں ہے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ خالص عمل آج تک باقی ہے اور تاابد باقی رہے گا (۱۶ جنوری ۱۹۹۴)۔

۲۔ عقل و منطق

امام حسینؑ کی تحریک عقل و منطق پر استوار تحریک تھی۔ اسلامی معاشرہ امام کا معاشرہ ہے۔ لیکن بنی امیہ نے اسلام میں امامت کی جگہ ملوکیت اور بادشاہت رائج کر دی (۹ جون ۱۹۹۶)۔ ایسے حالات میں مسند اقتدار پر بیٹھنے والا یزید نہ تو عوام الناس سے کوئی رابطہ رکھتا تھا، نہ اس کے پاس علم تھا، نہ پرہیزگاری تھی، نہ پاکدامنی تھی، نہ پارسائی تھی، نہ راہ خدا میں جہاد کا کوئی ماضی تھا، نہ اسلام کے روحانی امور پر اس کا کوئی عقیدہ تھا، نہ اس کا طرز عمل مومنانہ تھا، نہ گفتار حکیمانہ تھی۔ اس کی کوئی بھی خصوصیت پیغمبرؐ سے مشابہت نہیں رکھتی تھی۔ ایسے حالات میں حسینؑ ابن علیؑ کے لئے جو پیغمبرؐ کی جانشینی کی مکمل شائستگی رکھتے تھے، ایک مرحلہ پیش آیا اور آپ نے قیام کیا (۱۴ اپریل ۲۰۰۰)۔

حسینی تحریک اس حکمرانی کے خلاف بغاوت کی فکر پر مبنی تھی جس نے اسلامی امت پر سب سے بڑا انحراف مسلط کر دیا تھا۔

اس تحریک میں عقل و منطق کا عنصر حضرتؑ کے بیانوں میں نمایاں ہے۔ تحریک کے آغاز سے پہلے بھی، مدینہ میں آپ کی موجودگی کے وقت سے آپ کے یوم شہادت تک۔ یہ نورانی بیانات بڑی پختہ منطقی فکر کو پیش کرتے ہیں (۲۵ جنوری ۲۰۰۶)۔ جیسا کہ حضرتؑ دشمن فوج سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «ایّها النّاس، انّ رسول الله (ص) قال: «من رأی سلطاناً جائراً مستحلاً لحرام الله، ناکثاً لعهد الله، مخالفاً لسنّة رسول الله یعمل فی عباد الله بالاثم و العدوان ثم لم یغیّر بقول و لا فعل کان حقّاً علی الله ان یدخله مدخله» یعنی اگر معاشرے میں کوئی کسی حاکم کو دیکھے جو ظلم کر رہا ہے، حرام خدا کو حلال سمجھتا ہے، حلال خدا کو حرام قرار دیتا ہے، حکم الٰہی کو نظر انداز کرتا ہے، اس پر عمل نہیں کرتا، دوسروں کو اس پر عمل کی ترغیب نہیں دلاتا، یعنی لوگوں کے درمیان گناہ، عناد اور ظلم کر رہا ہے، بدعنوان، ظالم و جابر حکمراں ہے جس کا مکمل مصداق یزید تھا: «و لم یغیّر بقول و لا فعل» اور اپنی زبان اور عمل سے اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتا تو «کان حقّاً علی الله ان یدخله مدخله» اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس خاموش تماشائی، بے پرواہ اور بے عمل شخص کو اسی ظالم کے انجام میں مبتلا کرے گا، یعنی اسے اسی کی صف میں اور اسی کے زمرے میں قرار دے گا۔ یہ پیغمبر نے فرمایا ہے (۹ جون ۱۹۹۵)۔

۳۔ وقار

حضرت امام حسینؑ کے قیام کی ایک اور خصوصیت تھی وقار؛ امام حسینؑ کی تحریک وقار کی تحریک تھی۔ یعنی حق کے وقار، دین کے وقار، امامت کے وقار اور اس راستے کے وقار کی تحریک تھی جو پیغمبر نے پیش کیا تھا۔ امام حسینؑ وقار کا مظہر تھے اور جب ثابت قدمی کے ساتھ کھڑے ہوگئے تو مایۂ فخر و مباہات قرار پائے۔ یہ حسینیؑ وقار وافتخار ہے۔ کبھی کوئی شخص ایک بات کہتا ہے۔ اپنی بات کہہ دیتا ہے اپنا مافی الضمیر بیان کرتا ہے لیکن اس بات پر قائم نہیں رہتا بلکہ کبھی پسپائی بھی اختیار کر لیتا ہے۔ ایسے شخص کو افتخار کرنے کا حق نہیں ہے۔ افتخار کا حق اس انسان، اس قوم اور اس جماعت کو ہے جو اپنی بات پر قائم رہے اور جو پرچم اس نے بلند کر دیا ہے اسے کسی طوفان اور کسی ہوا کے جھونکے سے گرنے نہ دے۔ امام حسینؑ نے اس پرچم کو بڑی مضبوطی سے تھامے رکھا (۲۹ مارچ ۲۰۰۲)۔

یہ خصوصیت تحریک حسینی میں جا بجا نظر آتی ہے؛ جیسا کہ امام حسین نے جب ایک شب کی مہلت لی تب بھی آپ کا انداز پر وقار تھا۔ آپ جب فرماتے ہیں: «هل من ناصرٍ» طلب نصرت کرتے ہیں تب بھی آپ کا انداز پر وقار ہے۔ جب مدینے سے کوفے کے سفر میں ہیں اور مختلف افراد سے آپ کی ملاقات ہوتی ہے اور ان سے گفتگو ہوتی ہے اور ان میں بعض کو آپ اپنے ساتھ آنے کی دعوت دیتے ہیں تو یہ دعوت بھی کمزوری اور ناتوانی کے احساس کے ساتھ نہیں ہے۔ یہ بڑی نمایاں خصوصیت ہے (۲۵ جنوری ۲۰۰۶)۔

۴۔ بیکسی و مظلومیت

امام حسینؑ ظلم و جور کے خلاف اپنی تحریک اور جدوجہد میں اسلام کے احیاء کے لئے بے کسی کے عالم میں میدان میں اترے۔

سب سے سخت جدوجہد وہ ہے جس میں انسان تنہا ہو۔ عاشورا کے واقعے میں امام حسینؑ کے ساتھ عبد اللہ ابن عباس اور عبد اللہ ابن جعفر جیسے افراد بھی جو خود خاندان بنی ہاشم اور اسی شجرہ طیبہ سے تعلق رکھتے ہیں، مکے میں یا مدینے میں قیام کرنے اور آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر پائے، امام حسینؑ کے نام کا نعرہ نہیں لگا سکے۔ ایسی جدوجہد تنہائی کی جدوجہد ہے جو سب سے سخت جدوجہد ہوتی ہے۔ ہر کوئی دشمنی پر تلا ہوا، ہر کوئی روگردانی پر مصر! امام حسینؑ کی جدوجہد میں بعض احباب بھی مخالف ہو گئے۔ حضرت نے ایک سے فرمایا: "میرے ساتھ آؤ" مگر اس نے نصرت کے بجائے اپنا گھوڑا امام حسینؑ کے پاس بھیج دیا اور کہا کہ آپ میرا گھوڑا استعمال کیجئے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا تنہائی ہوگی، اس سے زیادہ شدید غربت کا عالم کیا ہوگا؟! پھر اس عالم غربت کے جہاد میں آپ کے

پیارے آپ کی آنکھوں کے سامنے شہید ہو گئے (۷ جون ۱۹۹۴)۔

امام حسینؑ کی مظلومیت آپ کی اسی تنہائی کا نتیجہ ہے۔ امام حسینؑ کے ساتھ ایک ہزار سے زائد افراد مکے سے روانہ ہوئے یا راستے میں آپ سے ملحق ہوئے مگر عاشور کی شب گنے ہوئے افراد آپ کے ہمراہ تھے، عاشور کے دن جب چند افراد آپ سے آکر ملے ان سب کو ملا کر مجموعی تعداد بہتر (۷۲) ہوئی۔ یہ مظلومیت ہی تو ہے۔ مگر یہ مظلومیت حقارت و ذلت کے معنی میں نہیں ہے۔ امام حسینؑ تاریخ اسلام کے سب سے عظیم مجاہد ہیں۔ کیونکہ آپ اس میدان میں ثابت قدمی سے کھڑے رہے، ہراساں نہیں ہوئے اور جہاد میں مشغول رہے۔ مگر اس عظیم ہستی کی جتنی عظمت ہے مظلومیت بھی اتنی ہی شدید ہے۔ آپ جتنے عظیم انسان ہیں اتنے ہی مظلوم بھی ہیں۔ عالم غربت میں آپ شہید ہوئے (اجولائی ۱۹۹۲)۔

یہی چیز اس تحریک اور اس راہ کے شہیدوں کی عظمت کا راز بھی ہے؛ شہدائے کربلا کی عظمت اسی وجہ سے ہے۔ یعنی انہوں نے اپنے فریضے کو سمجھا، فریضہ راہ خدا اور راہ دین میں جہاد تھا۔ وہ دشمن سے نہیں ڈرے، تنہائی سے نہیں گھبرائے، وحشت میں مبتلا نہیں ہوئے، اپنی تعداد کی کمی کو دشمن کے سامنے اپنی پسپائی کا جواز نہیں بنایا۔ یہی چیز انسان کو، کسی رہنما اور کسی ملت کو عظمت عطا کرتی ہے۔ دشمن کی کھوکھلی عظمت سے نہ ڈرنا (اجولائی ۱۹۹۲)۔

۵۔ روحانیت و بندگی

اللہ کے سامنے سر تسلیم خم رکھنا، یہ بھی ایسی خصوصیت ہے جو کربلا کی پوری تحریک میں ہر جگہ جلوہ گر ہے۔ امام حسینؑ نے مختلف مواقع پر اپنے عمل سے اس خصوصیت کا مظاہرہ کیا۔

امام حسینؑ کے طرز عمل میں روحانیت، وقار اور سربلندی کے ساتھ ہی ساتھ بندگی اور اللہ کی بارگاہ میں سراپا تسلیم رہنا بھی وہ خصوصیت ہے جو نمایاں ہے۔ یہ چیز تمام مراحل میں رہی۔ جب سیکڑوں بلکہ ہزاروں خطوط اس مضمون کے ساتھ آئے کہ ہم آپ کے شیعہ اور مخلص افراد ہیں اور کوفہ و عراق میں آپ کے منتظر ہیں تو آپ کسی غرور میں مبتلا نہیں ہوئے۔ جب آپ نے تقریر کی اور فرمایا: «**خط الموت علی ولد آدم مخط القلاده فی جید الفتاة**» موت کی بات کی۔ نہیں کہا کہ ہم ایسا کر دیں گے، ویسا کر دیں گے۔ آپ نے دشمن کو دھمکیاں نہیں دیں اور حمایت کرنے والوں کو کوفہ میں بڑے بڑے عہدے دینے کا لالچ نہیں دیا۔ آپ نے خالص اسلامی انداز میں معرفت میں ڈوب کر اپنی تحریک آگے بڑھائی، بندگی اور تواضع کے ساتھ جدوجہد کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج سب کے ہاتھ ان کی جانب پھیلے ہوئے ہیں اور لوگ

ان سے اظہار عقیدت کرتے ہیں۔ جب کربلا میں آپ کے سو سے بھی کم ساتھیوں کو تیس ہزار اوباشوں کے لشکر نے گھیر لیا اور ان سب کی جان خطرے میں پڑ گئی تب بھی آپ کے چہرے پر کہیں دور دور تک اضطراب نہیں تھا (۱۴ اپریل ۲۰۰۰)۔

مقصد قیام حسینی ؑ؟

حضرت امام حسینؑ سے کہا جاتا تھا کہ پورا مکہ اور مدینہ آپ کا احترام کرتا ہے اور یمن میں آپ کے اتنے چاہنے والے ہیں۔ کہیں بھی چلے جایئے تا کہ نہ آپ کو یزید سے کوئی مطلب ہو اور نہ یزید کو آپ سے کوئی سروکار۔ اتنے شیعہ، اتنے چاہنے والے، اتنے پیروکار ہیں آرام سے زندگی بسر کیجئے، خدا کی عبادت کیجئے اور اس کے دین کی تبلیغ کیجئے آخر یہ قیام کس لئے؟ آپ کا کیا مقصد ہے؟

بعض لوگ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ امام حسینؑ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ یزید جیسے فاسق و فاجر انسان کو حکومت سے برطرف کر کے خود حکومت کریں۔ ہم نہیں کہتے کہ یہ بات بالکل غلط ہے البتہ آدھی صحیح ہے۔ ان افراد کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ امام حسینؑ نے سوچا کہ قیام کرتے ہیں اگر کامیاب ہوگئے تو حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں گے اور اگر کامیاب نہ ہوئے تو واپس آجائیں گے۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔

جی ہاں! جو حکومت کی غرض سے قیام کرتا ہے وہ وہیں تک آگے بڑھتا ہے جہاں تک ممکن ہو لیکن جہاں اس نے دیکھا کہ اب آگے بڑھنا ناممکن ہے تو پلٹ آتا ہے۔ اگر کسی کا مقصد حکومت قائم کرنا ہوتا ہے تو اسے وہیں تک جانا چاہئے جہاں تک جانے کا امکان ہو لیکن جہاں سے آگے بڑھنا ممکن نہ ہو عقلمندی یہی ہے کہ پلٹ آئے۔

جو شخص یہ کہتا ہے امام حکومت علوی کے قیام کے لئے اٹھے تھے اور اس کی مراد یہ ہو جو اوپر بیان کیا گیا ہے تو اس کا نظریہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ امام حسینؑ کے قیام سے کہیں بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے۔

تو پھر کیا قیام کا مقصد شہادت تھا؟

بعض لوگ کہتے ہیں مقصد حکومت تھا یہ سب بیکار کی باتیں ہیں بلکہ امام حسینؑ جانتے تھے کہ وہ حکومت کا قیام عمل میں نہیں لا سکتے وہ تو اس لئے آئے تھے تا کہ خدا کی راہ میں قربانی دیں اور شہید ہو جائیں۔

ایک مدت تک لوگ اسی نظریہ کے قائل بھی تھے اور بعض لوگ شاعرانہ تعبیروں کے ساتھ اسے بیان کرتے بلکہ بعض بزرگ علماء بھی اس کے قائل ہوگئے تھے۔ اس گروہ کا کہنا تھا کہ امام عالی مقام نے دیکھا کہ اب زندہ رہنے کا کوئی مقصد نہیں لہٰذا شہادت کے ذریعہ ہی کچھ کیا جائے۔

اسلام اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا اس لئے اسلام اس بات کا قائل نہیں کہ جاؤ اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالو اور قتل کر دیئے جاؤ۔ شریعت اور دین نے جس شہادت کی بات کی ہے اس شہادت کا مطلب یہ ہے انسان ایک عظیم مقصد کی خاطر قیام کرے اور اس راہ میں اپنی جان بھی دیدے۔ یہ ہے وہ شہادت جسے اسلامی اور دینی شہادت کہا جا سکتا ہے شہادت یہ نہیں ہے میں دوڑ کر میدان میں جاؤں تا کہ شہید کر دیا جاؤں یا شاعرانہ تعبیر میں کہا جائے کہ میرا خون ظلم و ستم کے ایوان ہلا دے اور اسے منہ کی کھانے پڑے۔ امام حسینؑ کے عظیم قیام کا مقصد یہ بھی نہیں تھا جو کہا جاتا ہے۔

لہٰذا نہ کلی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے امام عالی مقام نے حکومت کے لئے قیام کیا اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے ان کے قیام کا مقصد شہادت تھا۔

ایک واجب کو انجام دینا

میری نظر میں جو لوگ "حکومت" یا "شہادت" کے قائل ہیں انہوں نے ہدف اور نتیجہ کو ملا دیا ہے۔ امام کے قیام کا مقصد یہ نہیں تھا، امام کے قیام کا مقصد کچھ اور تھا البتہ اس ہدف تک پہنچنے کے لئے انہیں ایک ایسا راستہ طے کرنا تھا جس کا نتیجہ دو ہی چیزیں تھیں حکومت یا شہادت امام حسینؑ ان دونوں چیزوں کے لئے آمادہ تھے۔ انہوں نے حکومت کے مقدمات کو بھی فراہم کر لیا تھا اور شہادت کی آمادگی بھی کر چکے تھے۔ اب جو بھی ہاتھ آتا وہی صحیح تھا، اس میں کوئی عیب نہیں تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی مقصد نہیں تھا بلکہ نتیجہ تھا۔ ہدف کچھ اور ہوتا ہے۔

اگر امام حسینؑ کے صحیح ہدف کو بیان کرنا ہے تو اس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ امام عالی مقام کے قیام کا ہدف ایک ایسے واجب کی انجام وہی تھا جو امام حسینؑ سے پہلے کسی نے انجام نہیں دیا تھا۔ یہاں تک کہ رسول اکرمؐ، امام علیؑ اور امام حسنؑ نے بھی۔ (۱۹۹۵/۵/۳۰)۔

اسلام کا ایک اہم رکن

اسلام کے عملی احکام کا صرف ایک حکم جسے پیغمبرؐ نے بیان کیا تھا لیکن اس پر عمل نہیں کیا تھا۔ اور یہ اسلامی نظام کے ارکان کا ایک اہم رکن ہے۔ اور وہ حکم اور رکن یہ تھا کہ جب بھی یہ اسلامی نظام اور اسلامی معاشرہ کی گاڑی پٹری سے نیچے آجائے اور اس کا نظام بالکل الٹ جائے تو اس وقت امت مسلمہ کی ذمہ داری کیا ہے؟ اگر بانی اسلام تمام اسلامی احکام و قوانین بیان کرتے لیکن صرف یہ ایک حکم بیان نہ کرتے تو ان کا کام ناقص رہ جاتا لیکن انہوں نے یہ بھی بیان کر دیا تھا۔ وہ مسلمانوں سے کہہ کر گئے تھے اگر کسی وقت بھی اسلامی معاشرہ اسلام کے دائرے سے باہر نکل جائے اور صاحبان قدرت و ثروت، مسلم نما منافقین یا

کوئی بھی اسلامی سماج کا رخ بدلنا چاہے تو اس کے مقابلے میں امت مسلمہ کو کیا کرنا ہوگا؟ پیغمبر اکرمؐ یہ کہہ کر گئے تھے لیکن خود عمل نہیں کر سکے کیونکہ پیغمبر اکرمؐ جب تک باحیات تھے تب تک امت مسلمہ اور اسلامی معاشرے میں ایسا کوئی انحراف پیدا نہیں ہوا تھا۔ اسلام کا یہ رکن پیغمبر اکرمؐ نے اس لئے بیان کیا تھا کیونکہ ان کے بعد ان کے جانشینوں کے زمانے میں ایسا ہونا عین ممکن تھا، چاہے وہ کسی بھی جانشین کے زمانے میں ہوتا۔ جس امام کے زمانے میں بھی یہ صورتحال پیدا ہوتی اسے وہی کرنا ہوتا جو پیغمبر نے بتایا تھا۔ اگر امیر المومنین علیؑ کے زمانے میں ہوتا تو وہ ویسا ہی کرتے جیسا پیغمبرؐ نے بتایا تھا یا اگر امام علی نقیؑ یا امام حسن عسکریؑ کے زمانے میں ہوتا تب بھی ان کی یہی ذمہ داری تھی۔ اب چونکہ یہ صورتحال امام حسینؑ کے زمانے میں پیش آئی لہٰذا ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس پر عمل کرتے۔ تاکہ اسلامی نظام اور اسلامی سماج کو دوبارہ اسی حالت پر لے آتے جہاں پر وہ پہلے تھا۔ یہ امام عالی مقام کی ذمہ داری تھی اور واقعہ عاشورا کی واقعیت اور حقیقت یہی ہے (۱۹۸۲/۱۰/۲۶)۔

سچائی کا خاتمہ ہو جاتا

امام عالی مقام جانتے تھے کہ اگر انہوں نے یہ قیام نہ کیا تو ان کا یہ سکوت اور خاموشی رضامندی کی علامت بن جائے گی اور پھر اسلام پر کیا مصیبت آن پڑے گی۔ جب ایک طاقت معاشروں یا کسی ایک معاشرے کے تمام وسائل پر قبضہ کر لے اور طغیان و بربریت کا راستہ پر گامزن ہو جائے، ایسے موقع پر حق و حقیقت کے علمبردار اگر خاموش بیٹھے رہیں اور ان کے مقابلے میں کھڑے نہ ہوں تو گویا وہ بھی اس طاقت کے عمل سے راضی ہیں چاہتے در حقیقت وہ راضی ہوں یا نہ ہوں۔ یہی وہ گناہ تھا جو اس وقت بنی ہاشم کے بہت سے بزرگوں اور صدر اسلام کی اہم شخصیات کی اولاد نے انجام دیا۔ لیکن امام حسینؑ کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی اس لئے آپ نے قیام کیا۔

واقعہ کربلا کے بعد جب قافلۂ حسینی واپس مدینہ میں آیا۔ (یعنی مدینہ مدینے سے نکلنے کے دس، گیارہ مہینے بعد) ایک شخص امام سجادؑ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگے: دیکھا کیا ہوا؟ کیا ملا وہاں جا کر؟ امام نے اس کے جواب میں فرمایا: سوچو اگر نہ جاتے تو کیا ہوتا؟!

جی ہاں! اگر نہ جاتے تو کیا ہوتا! جسم تو زندہ ہوتے لیکن سچائی دم توڑ چکی ہوتی، روح فرسودہ ہو جاتی، ضمیر مردہ ہو جاتے عقل و خرد کا جنازہ نکل جاتا اور اسلام کا نام و نشان باقی نہ رہتا۔ (۲۰۰۲/۳/۱۸)۔

زینبیؑ کردار

جناب زینبؑ کی شخصیت غم و اندوہ اور تیمارداری میں ہی خلاصہ نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک مسلمان خاتون کا

مکمل نمونہ تھیں۔ یعنی وہ آئیڈیل جسے اسلام نے خواتین کی تربیت کے لئے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ زینب کبریٰؑ کی شخصیت، ایک ہمہ گیر شخصیت ہے۔ عالمہ و عاقلہ، صاحب معرفت اور ایک نمایاں انسان کہ جب بھی کوئی ان کے سامنے کھڑا ہوتا ہے ان کی علمی و معنوی عظمت اور معرفت کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔

ایک مسلم خاتون جس پہلو کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتی ہے یہی ہے یعنی اسلام کو اپنے وجود میں بسانا۔ ایمان کی برکت اور اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دینے سے ایک مسلمان عورت کا دل اس قدر کشادہ ہو جاتا ہے اور وہ اتنی مضبوط ہو جاتی ہے کہ بڑے بڑے حادثات اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔

زینب کبریٰؑ کی زندگی کا یہ پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ عاشورا جیسا عظیم واقعہ زینبؑ کو جھکا نہیں سکا۔ یزید اور ابن زیاد جیسے ظالم و ستمگر افراد کی ظاہری حشمت اور جاہ و جلال زینبؑ کو نہ للکا رسکے۔ زینبؑ نے ہمیشہ اور ہر جگہ اپنے آپ کو ثابت قدم رکھا۔ ان کا وطن مدینہ ہو یا سخت امتحان و آزمائش کی آماجگاہ کربلا یا پھر یزید و ابن زیاد کا دربار ہر جگہ زینبؑ ثابت قدم اور سر بلند رہی اور باقی سب ان کے آگے سرنگوں ہوگئے۔ یزید اور ابن زیاد جیسے مغرور اور ستمگر افراد اس دست بستہ اسیر کے سامنے ذلیل و خوار ہوگئے۔

زینب کبریٰؑ کی شخصیت میں ایک طرف صنف نسواں کی عطوفت و مہربانی ہے او ردوسری طرف ایک مومن انسان کے دل میں پائی جانے والی متانت، عظمت اور سکون و پایداری، ایک مجاہد راہ خدا کی صاف اور گویا زبان۔ ایک پاک و خالص معرفت، جو ان کی زبان و دل سے نکلتی اور سننے والوں کو مبہوت کر دیتی ہے۔

ان کی نسوانی عظمت، جھوٹے بزرگوں کو حقیر و پست بنا دیتی ہے اسے کہتے ہیں نسوانی عظمت! حماسہ اور عطوفت سے مرکب وہ عظمت جو کسی فرد میں بھی دیکھنے کو نہیں ملتی۔

وہ ہستی جو اپنی متین شخصیت اور پایدار روح کے ذریعہ تمام ناگوار حوادث کو سر کر جائے اور بھڑکتے ہوئے شعلوں کو شجاعت و بہادری سے اپنے پیروں تلے روند ڈالے۔ لوگوں کو درس دے اور انہیں بیدار کرے۔ ساتھ ہی اپنے زمانے کے امام کو ایک مہربان ماں کی طرح تسلی و تشفی دے۔ اور ان نازک حالات اور طوفان حوادث میں یتیم بچوں کی حفاظت اور ان کی تسلی و تسکین کے لئے ایک محکم دیوار بن جائے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ جناب زینبؑ ایک ہمہ گیر شخصیت تھیں۔ اسلام ایک عورت کو اسی طرف لے جانا چاہتا ہے (۲۰۰۵/۶/۱۵)۔

ہنر مندانہ گفتگو

میری نظر میں جناب زینب کو ادبیات و ہنر کے ذریعہ عظیم واقعات وحوادث کی حفاظت کرنے اور انہیں بچانے کا بانی کہا جاسکتا ہے۔

اگر جناب زینبؑ نہ ہوتیں اور ان کے بعد دوسرے اہل حرم جیسے امام سجادؑ نہ ہوتے تو تاریخ میں واقعہ کربلا کا نام نہ ہوتا۔

سنت الٰہی یہی ہے کہ اس طرح کے واقعات تاریخ میں باقی رہیں ۔ البتہ سنت الٰہی کا یہ ایک شیوہ اور طریقہ ہے۔ تاریخ میں ان واقعات کی بقا کا طریقہ یہ ہے کہ صاحبان اسرار، اہل درد اور وہ افراد جو ان حقائق سے مطلع ہیں وہ دوسرے کو ان سے آگاہ کریں۔ اس لئے اپنی یاد داشت کو بیان کرنا، انہیں مدون کرنا اور حقائق کو دوسرے تک منتقل کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ بہت اہمیت کا حامل ہے اور اس کا اپنا ایک مقام و مرتبہ ہے۔ ہنرمندانہ بیان اور گفتگو اس کی ایک بنیادی شرط ہے جیسے کوفہ وشام میں جناب زینبؑ کے خطبات حسن بیان اور جذابیت کے اعتبار سے ایک ہنر مندانہ گفتگو تھی۔ ایک ایسی گفتگو کہ کوئی بھی ایسے نظر انداز نہیں کرسکتا۔ جب ایک مخالف اس گفتگو کو سنتا ہے تو وہ ایک تیز تلوار کی اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ہنر کا اثر اپنے مخاطب سے وابستہ نہیں ہوتا۔ وہ چاہے یا نہ چاہے ہنر اپنا کام کر دکھاتا ہے شام میں جناب زینبؑ اور امام سجادؑ نے اپنے فصیح و بلیغ اور ہنرمندانہ گفتگو کے ذریعہ یہی کام کیا(۲۰۰۵/۹/۲۲)۔

خدمت بندگان خدا

روایت میں ہے کہ عاشورا کے دن امام حسینؑ کے پشت مبارک پر کچھ اثرات روغا تھے۔ حضرت امام زین العابدینؑ سے ان کی وجہ معلوم کی گئی۔ آپؑ نے فرمایا:

«هذا مِمّا كانَ يَنْقُلُ الْجِرابَ عَلى ظَهْرِهِ الى مَنازِلِ الأرامِلِ وَ الْيَتامى وَ الْمَساكينِ»

"یہ اثرات اس بوجھ کے ہیں جو آپؑ اپنی پشت پر اٹھا کر بیواؤں، یتیموں اور بیکسوں کے گھروں میں پہنچاتے تھے"۔

(مناقب ابن شہر آشوب، ج۴، ص۶۶)۔

حفاظت اسلام میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا کردار

▪ تحریر: رئیس المبلغین علامہ سید سعید اختر رضوی گوپال پوری (رح)

نوٹ: مندرجہ ذیل تحریر علامہ رضوی کی کتاب "کربلاشناسی" سے اقتباس ہے، تفصیلی مباحث کے لئے اصل کتاب میں رجوع فرمائیں جو www.allamahrizvi.com پر موجود ہے۔ (ادارہ)

مقدمہ

مذہب اور حکومت کا باہمی تعلق کافی نازک ہے۔ جب تک حکمراں مذہب کی متابعت پر قانع رہیں، بات بنی رہی رہتی ہے۔ لیکن جہاں سے ان کا حوصلہ اپنی حد سے تجاوز کرتا ہے کہ وہ مذہب پر بھی حکومت کریں یا مذہب ان کا تابع رہے وہاں سے انتشار اور تباہی شروع ہو جاتی ہے۔ اس وقت چنگیزی کے ہاتھ میں دین کی تلوار بھی آجاتی ہے۔ ایسی حالت میں بالعموم مذہب ہی کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ بطور مثال عیسائیت کو شہنشاہ کانسٹنٹائن (EMPEROR CONSTANTINE) کے قبول مذہب نے سابق کے لامذہب حکمرانوں کی کھلم کھلا مخالفت کی بہ نسبت زیادہ نقصان پہونچایا۔

اسلامی حکومت کا تصور:

اسلام اس خطرہ کی طرف سے غافل نہیں رہا۔ اور اس نے اس کا علاج پہلے ہی سے مہیا کر رکھا تھا۔ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ اسلامی قوانین میں کسی طرح کی بھی ترمیم و تنسیخ کرے۔ اسلامی حکومت میں ''مجلس قانون ساز'' نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اللہ ہی حاکم اعلیٰ اور واحد قانون ساز ہے۔ جس کے قوانین رسول اکرمؐ کے ذریعہ ہم تک پہونچے، یہ قوانین آخری اور مکمل ہیں۔ اور ہر قابل تصور حالت اور ضرورت کے لئے اس میں سامان موجود ہے۔ اور اگر کسی مسئلہ کی تفسیر یا تشریح کی ضرورت ہو تو صرف وہی افراد اس فریضہ کو انجام دیں گے جنہیں اللہ نے اس کام کے لئے معین کیا ہے۔ یہ منصوص من اللہ امام ہیں جو معصوم ہیں اور جنہیں اللہ نے اپنے نبی کے ذریعہ مقرر کیا ہے۔

چونکہ اسلام رسولؐ کی زندگی میں ایک منظّم طریقۂ کار زندگی عطا کرتا ہوا آگے بڑھا اور چونکہ اس اسلامی ریاست کا ہر شعبہ رسول اکرمؐ کی الٰہی ہدایات کے مطابق کام کرنا تھا، یہ بالکل مناسب بلکہ اشد ضروری تھا کہ رسولؐ کی زندگی کے بعد زمام حکومت ان معصوم

اماموں کے ہاتھوں میں رہے جو رسول اکرمؐ کے بعد خدا کے نمایندے تھے اور اللہ کی طرف سے معین ہوئے تھے۔ یہ طریقہ اسلام کو مسخ ہونے سے بچاتا اور ہمیشہ کے لئے اسلام کو مستحکم بنیادوں پر قائم کر دیتا۔

اس طرح اسلام دنیاوی مغرور حکمرانوں کے چنگل سے آزاد رہتا اور بادشاہوں اور امیروں کے جذبانی پیچ وخم اور برخود غلط جوش وخروش سے پاک رہتا۔

یہی وجہ تھی کہ رسول مقبولؐ نے خداوند عالم کے حکم خاص کی بناپر یہ اعلان کر دیا کہ ان کے بعد امام بارہ ہوں گے۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتادیا کہ ''میں جس کا مولا ہوں علیؑ اس کے مولا ہیں'' یہ اقدام اس لئے کیا گیا تاکہ اسلامی شریعت سیاسی دووں پیچ کی قربان گاہ پر ذبح نہ کیا جاسکے۔

لیکن کچھ لوگوں کو جن کے حوصلے جائز و ناجائز کی قید کے پابند نہ تھے، یہ اچھا نہ معلوم ہوا اور انہوں نے یہ انتظام کیا کہ حکومت کی زمام علیؑ یا ان کے نائبین کے ہاتھوں میں نہ رہے اور اس طرح اسلام اس تحفظ سے جو اسے اللہ کے حکم سے دیا گیا تھا ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔ نتیجہ میں اسلام ان تمام خرابیوں کا شکار ہو گیا جو سابق کے مذاہب پر پڑ چکی تھی۔

اسلام کیوں انحطاط کا شکار ہوا؟

اس موضوع پر لکھنا کافی تکلیف دہ ہے۔ لیکن اگر ہم ماضی کا جائزہ حتی الامکان غیر جانبداری کے ساتھ لے سکیں تو ہمارے مستقبل کی ہدایت کے لئے یہ ایک مستحسن اقدام ہوگا۔

میں نے لوگوں کو تعجب کے ساتھ کہتے سنا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہو سکا کہ یزید جیسا شخص اور تاج خلافت پہن لے؟ وہ کون سی طاقتیں تھیں جنہوں نے اس حادثہ کے لئے راہیں ہموار کیں؟ دنیا میں کوئی کام بغیر علت نہیں ہوتا۔

جو لوگ واقعات کے دھارے میں بہہ رہے تھے ممکن ہے ان کو ہر ہر واقعہ کی اہمیت کا اندازہ نہ ہو سکا ہو، لیکن ہم لوگ جب ان واقعات پر آج نظر ڈالتے ہیں تو ہم ہر واقعہ کو اس کی صحیح جگہ پر آسانی سے رکھ سکتے ہیں۔ اور ہمارا فریضہ ان لوگوں کے فیصلے سے زیادہ صحیح ہوگا جو اس ڈرامہ میں عملی حصہ لے رہے تھے۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ کے ہر المیہ کی بنیادی وجہ جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے۔ یہ تھی کہ اسلام علیؑ اور ان کے بعد کے اماموں کی ہدایت سے محروم رہ گیا۔ یہی بہت بڑی مصیبت تھی، اس پر طرہ یہ کہ وہ خلفاء جو تخت سلطنت پر بیٹھے انہوں نے اپنے دنیاوی اقتدار کا پورا فائدہ اٹھایا اور عوام میں اس یقین کو رائج کیا کہ مذہب کی راہبری دنیاوی حکومت کے زیر نگین ہے۔ اور جو شخص بھی دنیاوی اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے (چاہے جس ذریعہ سے بھی ہو) وہ

دستوری اور جائز خلیفہ اور مذہبی رہنما ہے جس کو (بہ شہادت تاریخ) اس بات کا اختیار ہے کہ اسلامی شریعت میں ترمیم و تنسیخ کر سکے۔ اس غلط اعتقاد کیوجہ سے لوگوں نے حکمرانوں کے ہر کام کو مذہب کا معیار سمجھ لیا۔ جس کے نتیجہ میں اسلامی اصول اور شریعت کی پابندی میں انحطاط شروع ہو گیا۔

اسلام کا انحطاط:

یہ انحطاط رسول مقبولؐ کے فورا ہی بعد شروع ہو گیا جن لوگوں کو سیاسی اقتدار مل گیا تھا انہوں نے اس اقتدار کو کامل اور مستقل بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لہٰذا فطری طور پر مالیات اور عدلیہ کے قوانین کو اس طرح بدلہ گیا کہ ان کا مقصد پورا ہو سکے۔

صدقہ، زکوۃ اور غنیمت کی مستحقین کے درمیان مساوی تقسیم کا اصول چھوڑ کر یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ اصحاب رسولؐ کو ایک معینہ رقم بطور وظیفہ دی جایا کرے۔ سلوک کے ذریعہ ان لوگوں کی زبانوں پر مہر لگا دی گئی جو حکومت کے مخالفین کے مطابق ان کا اور ان کے خاندان کا حق ہے (کنزالعمال، ج۳، ص۱۴۵-۱۴۹۔ مسند امام احمد بن جنبل، ج۱، ص۴، الفاروق علامہ شبلی نعمانی، ج۲، ص۱۱۷)۔

یہاں یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ انہیں دنوں ایک صحابی رسولؐ حضرت جابر بن عبداللہ نے یہ دعویٰ کیا کہ رسولؐ نے ان سے فلاں فلاں چیزوں کا وعدہ کیا تھا۔ ان کے اس دعویٰ کو ثبوت یا گواہ طلب کئے بغیر مان لیا گیا۔ اس پالیسی کے نتیجہ میں جناب فاطمہؑ اور ان کے خاندان والے اپنی ذاتی جائداد سے بھی محروم کر دیئے گئے جبکہ حکومت کے منظور نظر حضرات نے بھاری دولت اکٹھا کر لی (صحیح بخاری، کتاب الخمس، صحیح مسلم، طبقات ابن سعد، ج۸۸)۔

یہاں چند مثالیں کافی ہوں گی۔

جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (جو سابق کے تینوں خلفاء کے منظور نظر تھے) مرے تو انہوں نے دیگر ورثہ کے علاوہ چار بیویاں چھوڑیں۔ ہر زوجہ کو شریعت کے لحاظ سے میراث سے ۳۲-۱واں حصہ ملنا چاہئے تھا۔ ان میں سے ایک طلاق رجعی کے عدہ میں تھی، اس لئے اس کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے قانونی حصہ سے کم لینا منظور کرلے۔ (یہ اسلامی شریعت کی مخالفت کی ایک اور مثال ہے) لہٰذا اس کو بتیسویں حصہ سے کم ملا اس کے باوجود اس کو ایک لاکھ درہم نقد ملا۔ (الاستیعاب ابن عبدالبر، ج۲، ص۵۶۰ و ج۱، ۲۰۸ و۲۱۰۔ Politicism Islam مصنفہ خدابخش خان، ص۱۵۱۔ مروج الذہب مسعودی، ج۲، ص۲۲۲)۔

طلحہ بن عبیداللہ (جو حکومت کے ایک اور چہیتے تھے) ان کی مستقل آمدنی دوسری آمدنیوں کے علاوہ دو ہزار دینار طلائی تھی۔ جب مرے تو انہوں نے بائیس لاکھ درہم اور بیس لاکھ دینار نقد کی صورت میں

چھوڑے۔ اس کے علاوہ غیر منقولہ جائداد تھی جس کی قیمت تین کروڑ درہم تھی (منبع مذکور)۔

نیز زبیر بن عوام نے موت کے وقت پچاس ہزار دینار، ایک ہزار گھوڑے اور سیکڑوں غلام ترکہ میں چھوڑے (منبع مذکور)۔

دولت جمع کرنے کے خلاف اسلامی تاکید کو بھلا دیا گیا۔ اور اسلامی دنیا میں ایک نئے سماج کی تشکیل ہوئی جو فطرت و کردار کے لحاظ سے اسلام کے بالکل مخالف تھا۔ لیکن لوگوں نے اسے بھی اسلام کے مطابق سمجھا۔ صرف اس وجہ سے کہ یہ ان حکمرانوں کا قائم کردہ تھا جو اسلام کے ترجمان اور مفسر سمجھے جاتے تھے۔

بنی امیہ کی سربلندی

اسلام کے لئے ان سب سے زیادہ نقصان دہ تھا، بنی امیہ کا پھر سے برسر اقتدار آنا۔ وہ بنی امیہ جو اسلام کے سب سے کڑ دشمن تھے۔ اور یہ بھی خلفاء کی سرپرستی میں ظہور پذیر ہوا۔ رسولؐ کی زندگی میں بنی امیہ ابوسفیان کی سرکردگی میں اسلام کے خلاف جنگ پر جنگ کرتے رہے۔ آخرکار ان کی طاقت اس وقت ختم ہوئی جبکہ رسولؐ نے سنہ ۸ ہجری میں بغیر کسی خونریزی یا جنگ کے مکہ فتح کرلیا۔ اب چونکہ دوسری کوئی صورت سامنے نہ تھی اس لئے ان لوگوں نے اپنے طریقۂ کار میں تبدیلی کی یعنی اب انہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا۔ لیکن اسلام کبھی بھی ان کے دل کے قریب نہیں پہونچا۔ کفر کا لہو ان کی رگوں میں ڈوڑتا رہا۔ کم از کم چھ جگہ قرآن مجید میں ان کی طرف اشارہ ہے۔ اور ہر جگہ انتہائی توہین کے ساتھ ان کی ملامت کی گئی ہے۔ قرآن کی نگاہ میں یہ لوگ شجرۂ ملعونہ لعنت کیا ہوا درخت یا خاندان ہیں (تفسیر در منثور، سیوطی، ج۴، ص۱۹۱، ذیل آیہ سورہ ۱۷، اسراء، آیت ۶۰، و دیگر کتب تفاسیر واحادیث)۔

یہاں عبدالرحمٰن بن عوف کی ایک حدیث قابل ذکر ہے۔ انہوں نے خلیفۂ دوم سے قرآن کی اس آیت کے متعلق پوچھا "وَ جاهِدُوا فِي اَللّٰهِ حَقَّ جِهادِهِ" (حج، ۷۸)۔ "خدا کی راہ میں اس طرح جہاد کرو جو جہاد کرنے کا حق ہے"۔ خلیفہ نے جواب دیا: یہ حکم اس وقت کے لئے ہے جب بنی امیہ حکمراں ہوں گے اور بنی مغیرہ ان کے وزیر ہوں گے۔ اس وقت مسلمانوں کا یہ فرض ہوگا کہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ ان کے خلاف جنگ کریں (تفسیر در منثور سیوطی، ج۴، ص۳۷۱)۔

کتنی تعجب خیز ہے فطرت انسانی کی یہ کرشمہ سازی بھی۔ کون یقین کرسکتا تھا کہ وہی خلیفہ جو یہ جانتا ہو کہ یہ ہر مسلمان کا فرض ہوگا کہ وہ بنی امیہ کے خلاف اللہ کی راہ میں جہاد کرے وہ بذات خود ان کی خود مختار گورنری شام میں قائم کرائے گا۔ اور شوریٰ کے ڈرامہ کا پلاٹ اس طرح ترتیب دے گا کہ ایک اموی

تیسرے خلیفہ کی شکل میں مسلمانوں کا مطلق العنان حکمران بن کر اسلامی دنیا پر مسلط ہو جائے، اس سے زیادہ تعجب خیز تو یہ ہے کہ یہ وہی عبدالرحمٰن بن عوف ہیں جنہوں نے تیسرے خلیفہ کی تخت نشینی میں ایک اہم رول ادا کیا۔

رسولؐ خدا کی زندگی کے آخری دور میں بنی امیہ بالکل خاموش رہے۔ لیکن رسولؐ کے انتقال کے بعد ان کو ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقع ملا۔ ابوسفیان پہلے حضرت علیؑ کے پاس آیا۔ لیکن حضرت علیؑ نے اسلام کے اس ذلیل دشمن سے کسی طرح کا ساز باز کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد وہ خلیفۂ اول کے پاس گیا۔ اگر انہوں نے بھی اسی طرح ابوسفیان کو ٹھکرا دیا ہوتا جیسے حضرت علیؑ نے کیا تھا تو کوئی مشکل نہ پڑتی۔ لیکن خلیفۂ دوم کی رائے سے اسے شام کی پیش کش کی گئی۔ ابوسفیان اس وقت بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس لئے اس کا بیٹا یزید ایک فوج کے ساتھ شام بھیجا گیا۔ اور شام کی فتحیابی کے بعد وہاں کا گورنر بنایا گیا۔ اور یزید کی وفات کے بعد اس کا بھائی معاویہ ابن ابی سفیان وہاں کا گورنر ہوا (تمام کتب تاریخ اسلام)۔

سیاست کا الٹ پھیر بھی کتنا عجیب ہے۔ کون سوچ سکتا تھا کہ وہ بنی امیہ جو رسولؐ کی زندگی میں اپنی تمام توانائی اسلام کو تباہ کرنے میں صرف کر رہے تھے ایک دن اسلامی حکومت کے واحد اجارہ دار بن جائیں گے۔ وہ کھلم کھلا دشمن بن کر اسلام کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ لیکن داخلی تباہ کاری کے ذریعہ انہوں نے اسلام کو قریب قریب بالکل برباد کر دیا۔ خلیفہ دوم کے بعد حضرت عثمان تیسرے خلیفہ ہوئے۔ جب لوگوں نے حضرت عثمان کے ہاتھوں پر بیعت کر لی تو ابوسفیان ان کے پاس آیا اور یہ مشورہ دیا "اے امیہ کے فرزندو! اب جبکہ یہ حکومت تمہارے ہاتھ آگئی ہے اس سے اس طرح کھیلو جیسے بچے گیند سے کھیلتے ہیں۔ اور اپنے خاندان میں ایک کے بعد دوسرے کی طرف منتقل کرتے جاؤ کیونکہ یہ حکومت ایک حقیقت ہے۔ یہی بہشت یا دوزخ تو ہمیں کیا معلوم کہ وہ ہے بھی یا نہیں" (الاستیعاب، ج۴، ص۸۶-۸۷؛ تاریخ ابوالفداء، ج۶۴)۔

ہمیں نہیں معلوم کہ زبان خلافت سے کیا جواب دیا گیا۔ لیکن تاریخ یہ گواہی ضرور دیتی ہے کہ اس مشورہ پر انتہائی فراخ دلی سے عمل کیا گیا۔

حکم بن عاص اور اس کے بیٹے مروان کو رسولؐ نے مدینہ سے خارج البلد کر دیا تھا۔ یہ خلیفۂ ثالث کا چچا تھا اور مروان ان کا داماد تھا۔ اس لئے انہوں نے رسولؐ کے فرمان کو بھلا دیا۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے مروان کو مدینہ میں واپس بلا لیا بلکہ اس کو اپنا مطلق العنان وزیر بھی بنا دیا۔ اس کے حوالے نہ صرف افریقہ سے آنے والا خمس (جس کی مقدار کئی

لاکھ دینار تھی) کر دیا گیا بلکہ فدک بھی اسے بخش دیا گیا۔ (خمس اور فدک کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے۔ (مروج الذہب، ج۲، ص ۶۲۳، کنزالعمال، ج۶، ص۹۰۔ تذکرہ خواص الآئمہ، ص ۱۳۴، فتح الباری شرح صحیح بخاری، ج۲، ص۱۴۱۔ روضۃ الناظر، مطبوعہ بامروج الذہب، ص۲۰۹)۔

عبداللہ بن ابی سرح خلیفہ کا ایک رشتہ دار تھا۔ فتح مکہ کے روز رسولؐ خدا نے یہ حکم دیا تھا کہ اسے اگر کعبہ میں بھی پاؤ تو قتل کر ڈالو۔ لیکن حضرت عثمان نے اس کے برخلاف اسے اپنے گھر میں پناہ دی اور کافی سفارش کے بعد اس کے لئے امان حاصل کرلی۔ حضرت عثمان کے دور خلافت میں ایسا شخص مصر کا گورنر بنایا گیا (الاستیعاب، ص ۲۹۲۔ الاصابۃ فی معرفۃ الصحابہ، ج۲، ص ۳۱۶-۳۱۷۔ تفسیر الدر المنثور، ج۳، ص۳۰)۔

ولید بن عقبہ خلیفہ کا چچازاد بھائی تھا۔ قرآن مجید اسے فاسق کے نام سے یاد کرتا ہے (الاصابۃ، ج۳، ص۶۳۲)۔

یہ ایک شرابی اور بہت ہی بدکردار آدمی تھا۔ لیکن اسے کوفہ کا گورنر بنایا گیا۔ ایک صبح یہ نشہ کی حالت میں مسجد میں آیا اور نماز صبح پڑھانی شروع کی اور حالت سرور میں دو کے بجائے چار رکعت نماز پڑھائی اور اس کے بعد لوگوں سے پوچھا کہ اگر تم کہو تو چند رکعتیں اور بھی بڑھادوں (تفسیر نیشابوری، ج۱، ص۷۲۔ تفسیر در منثور، ج۵، ص۱۷۸۔ تفسیر معالم التنزیل بغوی، ص ۷۰۔ تفسیر کشاف۔ تاریخ الخلفاء، سیوطی، ص ۱۰۵۔ تاریخ کامل ابن اثیر، ج۳، ص ۴۰۔ تذکرہ خواص الامۃ، ص ۱۱۷۔ شرح فقہ اکبر، ص ۹۲۔ مروج الذہب، ج۱، ص ۳۰۳، صحیح مسلم، ج۲، ص ۷۲)۔

صرف انہیں تین آدمیوں نے نہیں بلکہ بنی امیہ سے منسلک ہر فرد نے سلطنت میں کوئی نہ کوئی با اثر منصب حاصل کر لیا۔ (تاریخ الخلفاء، سیوطی، ص ۱۰۵۔ تاریخ کامل ابن اثیر، ص۴۰۔ اسپرٹ آف اسلام، سید میر علی، ص۴۱۷-۴۳۷)۔

ان لوگوں نے اپنے جاہ و مرتبہ کو اسلامی سماج کو کمزور کرنے، اسلامی اخلاق کو مسخ کرنے، اسلام کے اصول و قوانین کی بے حرمتی کرنے، عبادتوں کی تفلیک کرنے، مختصر یہ اسلام کی ہر چیز کو برباد کرنے کے لئے استعمال کیا۔

رسول مقبولؐ کی وفات کے پچیس سال کے اندر اندر اسلامی رہنمائی کا معیار مذاہب عالم کی طویل تاریخ کے پست ترین معیاروں کے ہمدوش ہوگیا عام طور سے مسلمان خدا کے بندے ہونے کے بدلے سونے اور چاندی کے بندے ہوکر رہ گئے۔ خلیفہ سوم قتل ہوئے، اس لئے نہیں کہ وہ بنی امیہ کو توانگر سے توانگر تر بنا رہے تھے۔ اور اس طرح اسلامی دولت کی مساوی تقسیم کے اصول کو مسخ کر رہے تھے۔ اس لئے بھی نہیں کہ وہ اپنے خاندان والوں کو مسلمانوں کا آقا بنا رہے تھے۔ جب کہ یہ لوگ قرآن کی نگاہ میں ملعون

خاندان والے تھے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ اسلامی دنیا کے دوسرے بڑے لوگوں کو یہ ناگوار ہو رہا تھا کہ ان کو خلیفہ صاحب نے نظر انداز کر دیا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ان کو بھی اس کا موقع ملنا چاہئے کہ وہ بھی اپنے گھروں کو سونے اور چاندی سے بھر لیں۔ ان کو بنی امیہ سے کوئی مخالفت نہ ہوتی اگر ان کو بھی اس دولت سے معتد بہ حصہ ملتا رہتا۔

حضرت علیؑ نے اسلام کو بچانا چاہا

حضرت علیؑ ہمیشہ اس بات کی کوشش کی کہ لوگوں کو اس بات کا احساس دلائیں کہ انہوں نے دوسروں کو اپنا مذہبی رہنما مان کر کیسی بھیانک غلطی کی ہے۔ حضرت علیؑ کا یہ طرز عمل ذاتی فائدہ کے لئے نہیں بلکہ اسلام کی خاطر تھا جو نا اہل لوگوں کے ہاتھوں میں پڑ کر لازمی طور سے مسخ ہوتا جا رہا تھا۔ جب خلیفۂ دوم کے بعد آپ کو اس شرط پر خلافت پیش کی جانے لگی کہ وہ سابق کے دو خلفاء کی سیرت پر چلیں گے۔ تو آپ نے اس خلافت کو ٹھکرا دیا۔ کیونکہ اس شرط کو ماننے کا مطلب یہ ہوتا کہ ان سابق خلفاء کی غیر قانونی خلافت پر مہر تصدیق ثبت کر دی جائے۔

خلیفہ سوم کے بعد جب لوگ آپ کے پاس آئے اور یہ دباؤ ڈالا کہ آپ خلیفہ ہونا قبول کر لیں تو آپ نے اس شرط کے ساتھ اسے قبول کیا کہ آپ رسولؐ کے زمانے کے اسلام کو پھر سے قائم کریں گے۔ آپ نے یہ خیال فرمایا کہ مجھے یہ موقع مل جائے گا کہ میں اسلام کو ان بدعتوں کے جھاڑ جھنکاڑ سے پاک کر دوں جن کو اسلام کے اصول سے مخلوط کر دیا گیا ہے (رجوع فرمائیں: نہج البلاغہ اور اس کی شروح)۔

لیکن حضرت علیؑ کا عدل و انصاف مسلمانوں کے مسخ شدہ لیڈروں کے کام و دہن کے لئے تلخ ثابت ہوا۔ وہ لوگ ترجیحی سلوک کے عادی ہو چکے تھے۔ اور اس غیر عادلانہ نظام کی تنسیخ ان کو انتہائی ناگوار گذری۔ اگر یہ بات نہ تھی تو آخر کون سی وجہ تھی کہ طلحہ و زبیر اور جناب عائشہ نے حضرت علیؑ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ جبکہ آپ نے اپنے مختصر دور خلافت میں اسلام کے اس اصلی نظام کو قائم کرنا چاہا جو رسولؐ کے زمانے میں جاری تھا۔

مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ سماجی اور معاشرتی اصول کے متعلق اس طرح بدل گیا تھا کہ وہ ان اصلاحات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جو حضرت علیؑ نے دوبارہ نافذ فرمائیں (نہج البلاغہ، الاستیعاب (مطبوعہ)، اصابہ ج ۳، ص ۴۷، تاریخ التمدن الاسلامی، ج ۴، ص ۳۷)۔

آپ کے خلاف جنگ کے بعد جنگ برپا کی گئی اور بالآخر آپ کو مسجد کوفہ میں نماز کی حالت میں شہید کر دیا گیا۔ اور اس طرح مسلمانوں نے وہ واحد موقع ہاتھ سے کھو دیا جس سے ان کا معاشرہ اسلام کے اخلاقی، معاشرتی، قانونی اور معاشی عدل و انصاف کی بنیاد پر دوبارہ قائم ہو سکتا۔

امام حسنؑ مدد کے لئے آگے بڑھے

امام حسنؑ (جو اپنے والد کی شہادت کے بعد اللہ کے نمائندہ تھے) یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کی بیماری اب اس منزل پر پہونچ چکی ہے جہاں اس کے علاج کی کوئی امید باقی نہیں رہی ہے۔ بد دیانتی ان کا ایمان، غداری ان کی وفا، دولت ان کی واحد محبوبہ اور ذاتی منفعت ان کا واحد مطمع نظر تھا۔ اب یہ ناممکنات سے تھا کہ ان کے درمیان خدائی حکومت پھر سے قائم کی جاسکے۔

امام حسنؑ کے سامنے اب سب سے اہم سوال یہ آیا کہ اسلام کے اصول کی حفاظت کیسے ہو؟ سابق کے بادشاہوں نے رسولؐ کے اقتدار اعلیٰ کے اعتقاد کو بادشاہوں کے اقتدار اعلیٰ کے اعتقاد میں بدل دیا تھا۔ ان لوگوں نے اس غلط عقیدہ سے فائدہ اٹھایا اور دنیا سے رخصت ہوئے۔ لیکناسلام کو انتشار سے دوچار کر کے۔ اس غلط اعتقاد کا باقی رہنا اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ تھا۔ اب جبکہ الٰہی حکومت کو پھر سے قائم کرنا ممکن نہ تھا۔ صرف ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ لوگوں کو یہ بتا دیا جائے کہ دنیاوی حکمرانی اور مذہبی رہنمائی ایک نہیں بلکہ دو الگ الگ چیزیں ہیں اور یہ کہ مذہب کی محافظت اور ترجمانی کی ذمہ داری اللہ کی طرف سے سپرد کی جاتی ہے۔ یہ بادشاہت نہیں ہے جو لوگوں کی عطا کردہ ہو، مقصد کہ لوگ ایک بار پھر دیکھ لیں کہ مذہب تاج و تخت کے ساتھ بندھا ہوا نہیں ہے۔

مذہب کو حکومت سے علیحدہ کیا جاتا ہے۔

حضرت علیؑ کے بعد صرف امام حسنؑ اور امام حسینؑ اس کام کو انجام دے سکتے تھے وہ بے شمار خصائص کے مالک تھے، عوام یا فوج کی طرف سے نہیں بلکہ اللہ اور رسولؐ کی طرف سے، ارشاد قرآنی کے مطابق وہ دونوں رسول کے بیٹے تھے (تفسیر جلالین، سورہ آل عمران، ج۱، ص ۱۱۸۔ صحیح مسلم، مشکوۃ المصابیح، ص۵۶۰-۵۶۲۔ ارجح المطالب عبیداللہ امرتسری)۔ ان کی مودت اور احترام مسلمانوں پر فرض تھا (قرآن مجید، سوری شوریٰ، تفسیر کشاف زمخشری، ج۲، ص۶۹۔ تفسیر در منثور، صحیح بخاری، صحیح مسلم، مسند احمد بن حنبل)۔ وہ ہر گناہ سے پاک تھے۔ اور ان سے کسی غلطی کا ارتکاب ممکن نہ تھا (قرآن مجید، سورہ احزاب، تفسیر در منثور سیوطی، ج۵، ص۱۹۸-۱۹۹۔ صحیح مسلم، مشکوۃ المصابیح، ص۶۱۔ ارجح المطالب)۔ وہ سردار جوانان جنت تھے (صحیح ترمذی، معجم کبیر، طبرانی، مشکوۃ المصابیح، ص ۵۹۲۔ مسند احمد بن حنبل، ارجح المطالب، سنن ابن ماجہ۔ تاریخ ابن عساکر دمشقی)۔ اور لوگوں پر ان کی فرماں برداری فرض تھی کیونکہ وہ امام تھے چاہے وہ بیٹھے ہوں یا کھڑے ہوں یعنی چاہے وہ صلح کریں یا جنگ (مختصر الناقب حافظ محمد بن یوسف بلخی، شافعی بحوالۂ مسند امام احمد بن حنبل)۔

اندریں حالات ان کے اختیارات ہر حالت میں مسلم تھے۔ چونکہ ان کی امامت سیاسی طاقت پر مبنی نہ تھی اس لئے وہ آسانی سے بے خوف و خطر مقتضائے حال کے مطابق حکومت کو ٹھکرا بھی سکتے تھے اور حکومت وقت کی مخالفت بھی کر سکتے تھے۔

اس لئے علیؑ و فاطمہؑ کے دلبندوں نے اللہ اور رسولؐ کے عطا کردہ کامل اختیار کے ساتھ ایک ایسا راستہ اختیار کیا جس سے مذہب کی گردن حکمرانوں کے آہنی چنگل سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جائے۔ اولا امام حسنؑ نے سیاسی طاقت کو چھوڑ دیا اور یہ دکھا دیا کہ ان کا مذہبی منصب حکومت کا مرہون منت نہیں ہے۔ امام حسنؑ کے اس اقدام سے یہ سب سے بڑا فائدہ ہوا کہ مسلم عوام کا نقطۂ نظر مذہب اور حکومت کے باہمی تعلق کے متعلق بدلنے لگا جیسا کہ بعد میں واضح ہو گا۔ معاویہ انتہائی کوشش کی کہ اسلام کے بہت سے اصولوں کو بدل دیا جائے مگر وہ ناکام رہا، اگر وہی تبدیلیاں اور بدعتیں سابق کے تینوں خلفاء کے زمانے میں ہوتیں تو مسلم عوام اس کو قبول کر لئے ہوتے۔ لیکن اب امام حسنؑ سامنے آچکے تھے۔ اور یہ تخیل پاش پاش ہو چکا تھا کہ مذہب حکومت کا دست نگر ہے۔ اس وجہ سے معاویہ کچھ زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔ بلکہ آج بہت سے سنی ہیں جو اسے خلیفہ تک ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

معاویہ کی غلط کاریاں

اب ہمیں ذرا دمشق کی طرف دیکھنا چاہئے۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ معاویہ عامۂ مسلمین کا تسلیم شدہ حکمراں ہے۔ انتخاب یا نامزدگی کے ذریعہ نہیں بلکہ قہر و غلبہ کی تلوار سے اس کے پہلے کی فضا ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ ہر غیر اسلامی تصور یا طریقہ جزو اسلام سمجھ لیا جاتا تھا۔ شرط صرف اتنی تھی کہ برسر اقتدار حکمران اسے پیش کرے۔ معاویہ نے اس تصور سے فائدہ اٹھانے کی انتھک کوشش کی۔ دولت کی خورد برد اپنے انتہائی عروج پر پہونچ گئی۔ زہر، تلوار اور سونا آزادی کے ساتھ حکمرانوں کے ظالمانہ منصوبوں کے لئے استعمال ہونے لگا۔ مخالفین کو قتل کرنا، مقابل کو زہر دغا سے شہید کرنا، اور جن لوگوں کی وفاداری مشکوک ہو، انہیں قید کرنا، ان کے گھر بار کو جلانا، جائداد کو لوٹنا، یہ سب روزمرہ کا معمول ہو گیا تھا (تاریخ الخلفاء، سیوطی، ص ۱۳۴۔ کتاب الاحداث، اسپرٹ آف اسلام، سید امیر علی، ص ۱۳۵)۔ امام حسنؑ ابن علیؑ ابن ابی طالبؑ کو زہر سے شہید کیا گیا (مروج الذہب، مطبوعہ با تاریخ کامل، ج ۶، ص ۵۵۔ تذکرہ خواص الامۃ، ص ۴۱-۴۳۔ النصائح الکافیہ، ص ۶۰۔ تاریخ ابوالفداء، ج ۱، ص ۱۸۳۔ تاریخ ابن عساکر، ج ۳، ص ۲۲۶۔ العقد الفرید ابن عبد ربہ اندلسی، ج ۲، ص ۲۱۱، ج ۳، ص ۱۲۳۔ الاستیعاب (مطبوعہ با اصابہ) ج ۱، ص ۳۷۵، تاریخ دول الاسلام، ج ۱، ص ۵۴۔ تاریخ روضۃ الصفا، ج ۲، ص ۷ و ص ۳۵۔ تاریخ ابن کثیر، ج ۸، ص

۴۳۔ تاریخ طبری، ج۲۔ کتاب الامامۃ والسیاسۃ، ص ۱۲۸۔ حبیب السیر، شواہد النبوۃ، ملاجامی، ص ۱۷۳۔ محرم نامہ خواجہ حسن نظامی، ص ۴۷)۔ حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کو اللہ کے نام امان دی گئی اور انتہائی درندگی سے شہید کر دیا گیا (الاصابہ، ج۱، ص ۳۱۵ و ۳۲۹۔ الاستیعاب، ص ۳۵۹-۳۵۸۔ تاریخ کامل، ج۲، ص ۱۸۵-۱۹۲۔ انوار الذہب، ص۲۱۰۔ تاریخ روضہ الصفا، ج۲، ص ۳۱۲)۔ مالک بن اشتر کو زہر سے شہید کیا گیا (تاریخ طبری۔ تاریخ کامل ۔ النصائح الکافیہ۔ انوار اللغۃ، ج ۱۶، ص ۲۱-۲۲۔ تاریخ روضۃ الصفاء ، ج۲، ص ۳۱۴) ۔ محمد بن ابی بکر (خلیفہ اول کے صاحبزادے) کو گدھے کی کھال میں سی کر جلا دیا گیا (النصائح الکافیہ، ص ۶۲۔ تاریخ طبری، ج۶، ص ۶۰۔ حیاۃ الحیوان امیری۔ ج۱۔ ص ۲۲۳۔ مروج الذہب، ج۲، ص۲۸۷۔ تذکرہ خواص الآئمہ، ص۶۰۔ تاریخ روضۃ الصفاء ۔ ج۲، ص ۲۱۴ و ج۲، ص۳۵۔ انوار اللغۃ، پ۱۶، ص۲۱-۲۲) ۔ جناب عائشہ کو (جو خلیفہ اول کی بیٹی اور رسولؐ کی زوجہ تھیں) ایک گڈھے میں گرایا گیا اور اس گڈھے کو چونا بھر کر بند کر دیا گیا اور ان کو اسی گڈھے میں گلنے کے لئے چھوڑ دیا گیا (اوائل السیوطی، ربیع الابرار زمخشری، کامل السفینہ، حبیب السیر، حدیقہ)۔ خالد بن ولید جن کو عوام سیف اللہ کہتے ہیں کے فرزند عبدالرحمٰن کو زہر سے مار اگیا (تاریخ طبری، تاریخ کامل، النصائح الکافیہ، تاریخ روضۃ الصفا، ج۲، ص ۲۵۔ استیعاب مع الاصابہ، ج۲، ص ۴۰۲)۔ عمرو بن حمق خزاعی جیسے باعزت صحابی رسولؐ کو بیدردی سے شہید کر دیا گیا (رجال کشی، ص۲۱-۲۳)۔

ہم نے ابوسفیان کا عقیدہ اوپر بیان کیا ہے۔ معاویہ اپنے باپ سے کچھ بہتر نہ تھا۔

معاویہ کے معتمد گورنر مغیرہ کی روایت یہاں نقل کرنے کے قابل ہے وہ ایک بار معاویہ سے گفتگو کر رہا تھا۔ دوران گفتگو معاویہ نے کہا (میں لوگوں کے لئے بھلائی کیوں کروں؟) اگر میں اچھے کام بھی کروں تو بھی یہ امید کیسے کر سکتا ہوں کہ میں اچھے نام سے یاد کیا جاؤں گا، دیکھو بنی تیم کی ایک فرد (یعنی خلیفہ اول) نے لوگوں پر حکومت کی اور ان کے لئے بہت بڑے بڑے کام کئے، لیکن جب وہ مرے تو ان کا نام بھی ان کے ساتھ ختم ہو گیا اب لوگ انہیں "ابو بکر" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور بات ختم۔ اس کے بعد بنی عدی کی ایک فرد آئی (یعنی خلیفہ دوم) اور پوری طاقت کے ساتھ دس سال تک حکومت کی لیکن ان کا نام بھی ان کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اور اب لوگ انہیں بھی اکثر اوقات "عمر" کہہ کر پکارتے ہیں اور بس۔ لیکن ابن ابی کبشہ کو دیکھو کفار قریش بغض و عداوت کے جوش میں رسول اکرمؐ کو اس نام سے پکارتے تھے (اور معاویہ ان کی تاسی میں رسولؐ کے لئے وہی نام استعمال کر رہا ہے)۔ کہ ان کا نام روزانہ پانچ وقت پکارا جاتا ہے۔ اور موذن ہر مسجد میں پکارتے ہیں کہ "میں گواہی

دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں" اب ان کی اس کامیابی کے بعد کون سا نام باقی رہ سکتا ہے۔ اور کون سا نیک کام یاد رکھا جاسکتا ہے (شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید معتزلی، ج۵، ص ۳۲)۔

رسولؐ اور اذان کی اس کھلی ہوئی تحقیر کے علاوہ ابوسفیان کے پوت سے اور کیا امید کی جاسکتی ہے؟ سیاسی گٹھ بندیوں، خیانتوں، بے ایمانیوں، بربریت اور کشت و خون کے علاوہ اس نے طریقۂ عبادت کو بھی بدلنے کی کوشش کی۔

عبادات میں "ایجاد بندہ" کی نظیریں سابق کے ادوار حکومت میں بھی ملتی ہیں۔ خلیفۂ دوم نے صبح کی اذان میں **"الصلوۃ خیرمن النوم"** کا اضافہ کیا (کنزالعمال، ج۴، ص۲۷۰-۲۷۱۔ موطأامام مالک۔ روضۃ الاحباب، ج۱، ص ۱۲۱) ۔ **"حی علی خیر العمل"** کو اذان سے خارج کردیا گیا (شرح تجرید، علامہ قوشنجی۔ شرح مقاصد تفتازانی) ۔ تراویح کی نماز با جماعت انہیں نے قائم کی (فلک النجاۃ، ج۲) ۔ خلیفۂ سوم نے نماز جمعہ کے پہلے ایک اور اذان کا اضافہ کیا (صحیح بخاری، ج۱، ص۱۹۔ ازالۃ الخفاء، ج۱، ص۱۱۶) ۔ اور عیدین میں نماز کے قبل خطبہ کی رسم جاری کی (تاریخ الخلفاء، ص ۱۱۷۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری، ج۱، ص۵۲۱) ۔ اور انہیں نے سفر میں بھی پوری چار رکعت نماز پڑھی بجائے دو رکعت کے جیسا کہ رسولؐ کے زمانہ میں تھا (نہایہ ابن اثیر، ج۲، ص ۲۱۲۔ صحیح بخاری۔ صحیح مسلم ۔ جمع بین الصحیحین)۔ لیکن معاویہ اس معاملہ میں سب سے آگے بڑھ گیا، اس نے نماز کے سورتوں سے **"بسم اللہ الرحمن الرحیم"** کو حذف کردیا (کنز العمال، ج ۴۔ ص ۲۱۰۔ تفسیر کبیر امام رازی، ج۱، ص ۱۶۰۔ خصائص یزید نامہ خواجہ حسن نظامی۔ ص ۱۱۰)۔ جیسا کہ پہلے نماز میں ہر عمل کے پہلے **"اللہ اکبر"** کہا جاتا تھا۔ اس نے اسے ختم کردیا (کنزالعمال، ج۴، ص ۲۱۰)۔ اس نے نماز جمعہ کا خطبہ منبر پر بیٹھ کر پڑھا (ازالۃ الخلفاء، ج۱، ص ۲۴۰۔ فتح الباری، ج۴، ص۲۱۶)۔ جب وہ حضرت علیؑ خلیفۂ رسولؐ سے لڑنے کے لئے جارہا تھا تو اس نے لشکریوں کو حکم دیا کہ نماز جمعہ بدھ کے روز ہی پڑھ لی جائے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ لوگوں نے اس پر عمل کیا (مروج الذہب، ج۲، ص ۳۳۲)۔ اس نے حج کے موقع پر صفا و مروہ کے درمیان قدم سے چلنے کے بجائے بغیر کسی عذر کے گھوڑ سواری کی (اوائل السیوطی)۔ اس نے تلبیہ **"لبیک اللھم لبیک"** کو حج سے نکال دیا (کنزالعمال، ۳، ص ۳۰)۔

لیکن ان سب سے زیادہ اہم تبدیلی نماز میں ہاتھ کا باندھنا ہے اس بات کے کافی قراین موجود ہیں کہ یہ معاویہ ہی تھا جس نے یہ طریقہ ایجاد کیا۔ امام مالک (مالکی فرقہ کے بانی) نے اپنے ماننے والوں کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنا ہاتھ کھلا اور سیدھا رکھیں (جیسا کہ شیعہ کرتے ہیں) اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ مدینہ کے لوگ

اپنا ہاتھ نماز میں کھلا رکھتے ہیں۔ اور اہل مدینہ نے رسولؐ کو عبادت کرتے دیکھا ہے۔ اور جو طریقہ اہل مدینہ کا ہے وہ یقینا رسولؐ ہی کی پیروی پر مبنی ہوگا۔ امام مالک کی وفات سنہ ۱۷۹ ہجری میں ہوئی۔ ان کے اس استدلال کے علاوہ عبداللہ بن زبیر (دراسۃ اللبیب۔ ص ۳۳۰۔ فتح المنان، عبدالحق دہلوی۔ شرح کنز الدقائق عینی، ص ۲۵) ابن سیرین، تسہیل القاری، پ ۳، ص ۸۳-۸۴) اور اسلامی شریعت کے دوسرے آئمہ کی بیان کردہ حدیثیں اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ کم از کم دوسری صدی ہجری تک مدینہ کے لوگ نماز میں ہاتھ نہیں باندھتے تھے۔ اس کے مقابل میں امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل (جنہوں نے عراق یا شام میں جہاں بنی امیہ کا اثر تھا، تعلیم و تربیت پائی) اپنے پیروؤں کو ہاتھ باندھنے کا حکم دیا۔ اور اس سے بھی زیادہ دل چسپ یہ بات ہے کہ امام شافعی نے (جنہوں نے ابتدائی زندگی مکہ اور مدینہ میں گذاری اور بعد میں عراق و مصر میں مقیم ہوئے) ہاتھ کھولنے اور باندھنے دونوں کو جائز کہا ہے۔

نماز میں تبدیلیوں کے کچھ اور ثبوت رسولؐ کے دوصحابیوں سے ملتے ہیں۔ حضرت انس بن مالک (رسولؐ کے ایک بوڑھے صحابی) دمشق گئے۔ جو کچھ انہوں نے وہاں دیکھا اس پر بے اختیار گریہ کرنے لگے۔ انہوں نے کہا: میں تمہارے درمیان سے کوئی ایسی چیز نہیں پاتا جو رسولؐ کے زمانے میں دیکھا کرتا تھا سوائے اس نماز کے اور وہ بھی مسخ کی ہوئی (صحیح بخاری مع فتح الباری، ج ۲، ص ۱۰۴)۔

رسولؐ کے دوسرے صحابی حضرت ابودرداء نے کہا "میں یہاں کوئی چیز شریعت کے مطابق نہیں پاتا۔ سوائے اس کے کہ یہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھ لیتے ہیں اس کے علاوہ ہر چیز متروک ہے" (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۸۰-۸۱۔ صحیح مسلم، ج ۲)۔ حضرت علیؑ جب معاویہ سے جنگ کر رہے تھے تو انہوں نے فرمایا "ہم ان لوگوں سے اس لئے جنگ کر رہے ہیں تاکہ پھر سے نماز کو قائم کر سکیں" (انوار الہدایہ، باب ۱۵)۔

یہاں یہ بات بتانی مناسب ہوگی کہ جب حضرت علیؑ نے اپنے دور خلافت میں نماز پڑھائی تو لوگ مسرت سے بے قابو ہو کر چلائے کہ "یہ نماز ٹھیک ویسی ہے جیسی رسولؐ پڑھاتے تھے"۔ ہم نے ایک عرصۂ دراز کے بعد رسولؐ کی نماز دیکھی ہے۔ ایسے تاثرات ظاہر کرنے والوں میں عمران بن حصین (صحیح بخاری، ج ۲، ص ۴۱۸-۴۱۹۔ صحیح مسلم، ج ۱، ص ۱۲۹)، ابو موسیٰ اشعری (سنن ابن ماجہ (مع اردو ترجمہ)، ج ۱، ص ۳۱۹) اور ابوہریرہ (یزید نامہ، ص ۱۱۰۔ حبیب السیر، حاشیہ فوائد جونپوری) کے نام قابل ذکر ہیں۔

اسلام میں معاویہ پہلا شخص تھا جس نے تجارت میں سود صرف لیا ہی نہیں بلکہ اس کو شرعی حیثیت سے جائز بھی بنانا چاہا (صبح صادق، نظام الدین شرح نہج

البلاغہ، ج۵، ص ۲۵۳۔ دراسۃ اللبیب، ص ۶۲-۶۳) ۔ وہ کھلم کھلا شراب (مسند احمد بن حنبل، ج۵۔ اوائل السیوطی) گانے بجانے اور رقص و سرور سے لطف اندوز ہوتا تھا حالانکہ ان چیزوں کو اسلام میں صاف صاف حرام قرار دیا گیا ہے (مسند ابویعلی۔ تاریخ ابوالفداء۔ محاضرات امام راغب اصفہانی۔ اوائل السیوطی)۔

اس نے رسولؐ کے ابن عم، داماد اور خلیفہ حضرت علیؑ پر سبّ و شتم کی بدعت جاری کی اور یہ شرمناک سلسلہ مسلمانوں میں پہلی صدی ہجری کے آخر تک جاری رہا (صحیح مسلم، ج۲، ص ۱۶۲۔ تاریخ الخلفاء، ص ۱۶۶۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید معتزلی، ج۲، ص ۲۲۵ و ج ۴، ص ۱۵۔ شرح مشکوۃ عبدالحق دہلوی، ص ۳۰۰۔ منہاج السنۃ ابن تیمیہ، ج۳، ص ۱۷۸۔ حیوۃ الحیوان دمیری، ج۱، ص ۶۳۔ مروج الذہب، ج۳، ص ۱۲۰۔ تاریخ طبری، ج۱، ص ۹۲۔ تاریخ ابوالفداء۔ ج۱، ص ۱۹۲۔ العقد الفرید ابن عبد ربہ، ۳، ص ۱۲۶۔ سیرۃ النبی شبلی نعمانی، ج۱، ص ۶۱، تاریخ روضۃ الصفا، ج۲، ص ۵)۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ حضرت علیؑ وہ ہیں جن کی مودت قرآن اور احادیث رسولؐ کے مطابق ہر مسلمان پر فرض ہے۔ علیؑ سے محبت رسولؐ سے محبت ہے اور علیؑ سے عداوت رسولؐ سے عداوت ہے۔ علیؑ سے صلح و آشتی رسولؐ سے صلح و آشتی اور علیؑ سے جنگ رسولؐ سے جنگ ہے اور علیؑ پر سب و شتم رسولؐ پر سب و شتم ہے (مسند ابویعلی، معجم طبرانی، مسند احمد بن حنبل، صواعق محرقہ ابن حجر مکی، مشکوۃ المصابیح، ص ۵۵۵-۵۵۷)۔

معاویہ نے قرآن و اسلام کے مسلمہ قوانین کی کھلم کھلا مخالفت کرتے ہوئے جمعہ کے خطبہ میں یہ اعلان کیا کہ حکومت کی کل آمدنی اس کی ذاتی ملک ہے اور اس کا مسلمانوں میں تقسیم کرنا یا نہ کرنا اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ اگر وہ اس میں سے کسی کو کچھ دینا چاہے تو اس کی مرضی اور اگر ایسا نہ کرے تو پھر کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کے متعلق پوچھے کیونکہ یہ اس کی ذاتی دولت ہے (میزان الاعتدال، امام ذہبی)۔

یہ چند مثالیں صاف طور پر ظاہر کرتی ہیں کہ معاویہ نے کس طرح نہ صرف عبادت میں بلکہ اسلام کے ہر شعبہ میں تبدیلی کرنی چاہی، اگر وہ پوری طرح اس میں کامیاب نہ ہو سکا تو اس کی واحد وجہ امام حسنؑ کی الٰہی سیاست تھی۔

تذکرہ

یہ بھی کہتا چلوں کہ امام حسنؑ کی سیاست اس حیثیت سے بھی کامیاب رہی کہ اس کی وجہ سے سچے مومنین اور منافقین میں پوری طرح تمیز ہو گئی۔ امام حسنؑ کے پدر بزرگوار کی زندگی کے آخری چار برسوں میں سب مسلمان ان کو مسلم حکومت کا سربراہ مان رہے تھے۔ اس میں کچھ لوگ وہ تھے جو آپ کو منصوص من اللہ کی حیثیت سے مانتے تھے اور اکثریت ان کی تھی جو آپ کو اجتماعی خلیفہ مانتے تھے۔ مختلف نظریات

رکھنے والے آدمیوں کے اس جم غفیر سے دین کو کوئی فائدہ نہ تھا۔ جیسا کہ حالات نے پوری طرح ظاہر کر دیا۔ معاویہ کے ساتھ امام حسنؑ کی مصالحت نے اس بے یقینی کی کیفیت کو ختم کر دیا۔ اور امام حسنؑ کے ساتھ اب صرف وہی سچے مومنین رہ گئے جن کا عقیدہ دنیاوی سیاست کی قلابازیوں کے ساتھ بدلنے والا نہ تھا۔

انسان معاویہ کے دور کی اتنی تاریخ کا مطالعہ کرے تو شاید یہ سوچنے لگے کہ اسلام کا اس سے زیادہ انحطاط ناممکن تھا۔ لیکن یہ کہنا قبل از وقت ہے کیونکہ ابھی اس ڈرامہ کا آخری پردہ نہیں اٹھا ہے۔ اس کے منصوبوں میں سب سے زیادہ نفرت انگیز منصوبہ یزید کو اپنا جانشین مقرر کرنا تھا۔ اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے اس نے ہر ممکن تدبیر اختیار کی، چاہے وہ رشوت ہو یا زبردستی۔ چال بازی ہو یا دروغ بافی، زہر خورانی ہو یا کھلم کھلا قتل و غارت (تاریخ روضۃ الصفا، ج ۳، ص ۲۵-۳۱۔ تاریخ کامل، ص ۲۰۱، تاریخ الخلفا، ص ۱۳۳)۔

اس منحوس جانشینی کے اعلان کے چند برسوں بعد مسلمانوں کا حکمراں اپنے کو جانشین رسولؐ کہنے والا، معاویہ اپنے گلے میں صلیب لٹکائے ہوئے اس دنیا سے اٹھا (محاضرات امام راغب اصفہانی)۔ اب یزید پوری اسلامی مملکت کا حاکم مطلق تھا جو شمال میں آذربائیجان سے جنوب میں یمن تک اور مغرب میں مصر تک، تو مشرق میں ایران تک پھیلی ہوئی تھی۔

یزید کے عقائد و اعمال

رسولؐ کے اس نام نہاد خلیفہ کا کیرکٹر کیسا تھا؟ وہ ایک ایسا آدمی تھا جو کھلم کھلا رسولؐ کی رسالت سے انکار کرتا تھا۔ اس نے ان چند اشعار میں اپنے عقیدہ کو صاف ظاہر کیا ہے۔

''بنی ہاشم اور رسولؐ اور ان کے خاندان والوں نے حکومت حاصل کرنے کے لئے ایک کھیل کھیلا تھا، حقیقت میں ان کے پاس نہ تو کوئی فرشتہ آیا تھا اور نہ کوئی وحی نازل ہوئی تھی''۔

اس غلط عقیدہ میں سرشار وہ اسلام و کفر کی پوری کشمکش کو دو خاندانوں کی جنگ سمجھتا تھا اور خوشی سے پھولے نہیں سماتا کہ وہ اپنے آباء و اجداد کا قصاص رسولؐ کے خاندان والوں سے لینے میں کامیاب ہو گیا۔

''کاش میرے اسلاف زندہ ہوتے جو جنگ بدر میں قتل کئے گئے اور دیکھتے کہ ان کے مخالفوں (اہل بیت رسولؐ) پر کیسے کیسے ظلم ڈھائے گئے تو وہ خوشی سے چلا اٹھتے کہ ''اے یزید! تیرے ہاتھ کبھی شل نہ ہوں'' ہم نے ان کے سردار کو قتل کیا اور اس طرح ان سے بدر کا قصاص لے لیا ہے، اور میں خندف کی اولاد کہے جانے کا مستحق نہیں تھا اگر میں محمدؐ اور ان کے خاندان والوں سے بدلہ لینے میں چوک جاتا'' (تاریخ کامل ابن

اثیر، ج۷، ص ۱۶۰۔ تاریخ خمیس، ج۲، ص ۱۸۴۔ تاریخ ابن الوردی، ج۱، ص ۲۴۴۔ تاریخ الخلفاء، ص ۱۲۹۔ اور دوسری کتب تاریخ اسلامی)۔

رسولؐ اور اسلام کے متعلق اس کے عقیدے کو ظاہر کرنے کے لئے اتنا کافی ہے، اب کچھ اشعار اسلام کے دوسرے ارکان کے بارے میں سنئے۔

قیامت: ''اے میری محبوبہ! (مرنے کے بعد پھر ملاقات ہونے کا یقین نہ کرے) کیونکہ مرنے کے بعد روز قیامت پھر سے زندہ ہونے کے متعلق تو نے جو کچھ سنا ہے وہ صرف ایک خیالی افسانہ ہے جو اس حقیقی دنیا کی سچی خوشی سے دل کو غافل کر دیتا ہے''۔

شراب اور عبادت: ''تمہارے خدا نے یہ نہیں کہا ہے کہ جہنم ان لوگوں کے لئے ہے جو شراب پیتے ہیں بلکہ اس نے کہا کہ کہ ''جہنم ان لوگوں کے لئے ہے جو نماز پڑھتے ہیں'' (ذبح عظیم، اولاد حیدر فوق، ص۵۶۱)۔

ان کفریات کے پس منظر میں اس کے غلط کارناموں کو بھی بتانا ضروری ہے۔

تاریخ انسانی کے سب سے بڑے المیہ یعنی ''سانحۂ کربلا'' سے قطع نظر اس نے ان گنت کام ایسے کئے جن میں کوئی بھی اس بات کے لئے کافی ہے کہ اس پر ہمیشہ لعنت بھیجی جائے۔

یہاں صرف دو مثالیں اس کی ان غلب کاریوں کی دے رہا ہوں جن میں وہ کامیاب نہ ہو سکا لیکن اس کی کوشش اس کے کیرکٹر کو صاف ظاہر کرتی ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ معاویہ کا نامزد ولیعہد تھا۔

سب سے پہلے اس نے رسولؐ کی زوجہ جناب عائشہ سے شادی کرنی چاہی (مدارج النبوۃ محدث دہلوی) اس وقت حضرت عائشہ کا سن پچاس سال سے زیادہ تھا۔ اس خواہش کا واحد مقصد صرف یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ رسولؐ اور قرآن کی ہتک حرمت کرنا چاہتا تھا کیونکہ قرآن نے رسولؐ کی ازواج سے شادی کرنا مسلمانوں کے لئے حرام قرار دیا ہے (سورہ احزاب، آیہ۶)۔ اور مسلمانوں کی توہین مقصود تھی جو ازدواج رسولؐ ''امہات المؤمنین'' بحکم قرآن کہتے ہیں۔

وہ اپنی اس خواہش میں اپنے باپ کی وجہ سے باز آیا۔ جو ایک چالاک سیاست داں تھا۔ اور اچھی طرح جانتا تھا کہ اس اشتعال انگیزی کی وجہ سے یزید کی خلافت کے تمام مواقع ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گے۔

دوسرے اس نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ خدا کے گھر یعنی کعبہ کی چھت پر شراب پیئے۔ اس موقع پر بھی اس کے دوستوں اور مشیروں نے اس ارادے سے باز رکھا (ذبح عظیم، ص۵۸۸)۔

خلافت ملنے کے بعد اس نے کھل کر اسلامی عبادات کا مذاق اڑانا شروع کیا (جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے) اس نے کتوں اور بندریوں کو مذہبی رہنماؤں

کے لباس پہنائے۔ قمار بازی اور بھالوؤں کے ساتھ کھیلنا اس کی وقت گذاری کا پسماندہ مشغلہ تھا۔ وہ اپنا سارا وقت ہر جگہ اور ہر موقع پر شراب نوشی میں بلا جھجھک گذارتا تھا۔ اس کی نگاہ میں کسی عورت کی کوئی حرمت نہ تھی یہاں تک کہ محرمات یعنی ماں، بہنیں، پھوپھیاں، بھتیجیاں وغیرہ بھی اس کی نظر میں عام عورتوں کی طرح تھیں (تاریخ الخلفاء سیوطی، صواعق محرقہ ابن حجر مکی، تمانچہ بر رخسار، ص ۳۹)۔

مدینہ کی غارت گری

اس نے مدینہ پر فوج کشی کی اور رسول خداؐ کا یہ مقدس شہر آزادانہ لوٹا گیا، تین سو کنواری لڑکیاں (دوسری عورتوں کے علاوہ) ان کی ہوس کا نشانہ بنیں۔ تین سو قاریان قرآن اور سات سو صحابۂ رسولؐ بے رحمی کے ساتھ شہید کر دیئے گئے۔ رسولؐ کی مقدس مسجد کئی دنوں تک بند رہی۔ اور یزید کی فوج نے اسے اصطبل کے طور پر استعمال کیا۔ کتوں نے اسے اپنی جائے پناہ بنایا جن کی گندگی سے رسولؐ کا پاک منبر بھی نہ بچ سکا (تاریخ ابوالفداء، ص ۴۶۶۔ تذکرہ خواص الامہ، سبط ابن جوزی)۔ آخر کار فوج کے سپہ سالار نے مدینہ کے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ یزید کی بیعت ان الفاظ میں کریں کہ: ''ہم یزید کے غلام ہیں اور اس کی مرضی پر منحصر ہے کہ چاہے تو ہمیں ہماری آزادی واپس دے، چاہے تو ہمیں غلاموں کی منڈی میں بیچ دے'' اور جن لوگوں نے اس بات پر بیعت کرنی چاہی کہ ''یزید قرآن اور احادیث رسولؐ کی پیروی کرے گا'' انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا (تاریخ ابوالفداء۔ تذکرہ خواص الامہ، سبط ابن جوزی۔ تاریخ روضۃ الصفا، ج ۲، ص ۶۶)۔ یہاں پر یہ بتانا بیجا نہ ہوگا کہ رسولؐ کی حدیث ہے کہ:

''جس نے مدینہ کے لوگوں کو ڈرایا اس پر خدا کی دائمی لعنت ہے'' (الرد علی التعصب، ابن جوزی)۔

مکہ کا محاصرہ

اس کے بعد یزید کے حکم سے فوج مکہ روانہ ہوئی۔ اور ان لوگوں نے خدا کے مقدس شہر کا محاصرہ کر لیا۔ یہ فوج شہر میں داخل نہیں ہو سکی اس لئے انہوں نے منجنیق کا استعمال کیا اور اس کی مدد سے کعبہ کو پتھروں اور جلتی لکڑیوں کا نشانہ بنایا۔ کسوۃ یعنی غلاف کعبہ نذر آتش ہو گیا اور مقدس کعبہ کا ایک حصہ زمین پر آرہا۔ (تذکرہ خواص الامہ، تاریخ طبری، تاریخ روضہ الصفا، ج ۳، ص ۶۷)۔

اس طرح ہم اس دور تک آپہونچے ہیں جہاں ہر اسلامی چیز پر اصول دین سے مقدس عبادات تک، خانگی زندگی سے سماجی نظام تک پر حملہ ہو رہا تھا۔ اور انہیں برباد کیا جا رہا تھا۔

کس کے ذریعہ؟

یزید کے ذریعہ جسے ان کا نگہبان و محافظ فرض کیا جاتا تھا۔

اور سب سے اہم معاملہ یہ تھا کہ ان بدعتوں میں سے کچھ چیزیں یقینا اسلامی سمجھ کر جزو اسلام بنا دی جاتیں کیونکہ پچھلے پچاس برسوں میں لوگوں کو اس بات کا عادی بنا دیا گیا تھا کہ حکمراں جو کام کرے اسے اسلام کا معیار حقیقی سمجھ لیا جائے۔ آج اسلام کا کہیں پتہ نہ ہوتا اگر امام حسنؑ اس ذہنیت پر بریک نہ لگایا ہوتا اور امام حسینؑ کھل کر سربراہ حکومت (یعنی یزید لعین) کے مقابلے کے لئے سامنے نہ آگئے ہوتے۔

امام حسینؑ کے مصائب

کسی دوسرے شخص میں نہ تو اتنی ہمت تھی اور نہ کسی کو اسلام سے اتنی محبت تھی، نہ اسلام کے متعلق کسی پر اتنی ذمہ داری عائد ہوتی تھی جتنی امام حسینؑ پر تھی حسینؑ رسولؐ کے نواسے تھے۔ علیؑ و فاطمہؑ کے لخت جگر تھے اور امام حسنؑ کے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ ان سب کے وارث اور جانشین تھے۔ اسلام وہ دین تھا جو ان کے نانا لے کر آئے تھے اور قائم کیا تھا۔ شروع ہی سے یہ خاندان اسلام کا بے لوث محافظ رہا۔ اسلام کے لئے اس خاندان والے ہر قربانی دے سکتے تھے۔ اور بارہا جو کچھ ان کے پاس تھا یہاں تک کہ اپنی اور اپنے پیاروں کی جان تک اسلام کے لئے قربان کر چکے تھے۔ امام حسینؑ تو ان کے عادی تھے کہ اسلام کی قربان گاہ پر ہر چیز نثار کر دی جائے۔ انہوں نے اسلام کو خطرہ میں دیکھا اور اس کی حفاظت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ یہ سب سے بہتر موقع ہے کہ اسلام کے ایک موثرترین اور آخری قربانی پیش کر دی جائے تاکہ اسلام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہر خطرہ سے آزاد ہو جائے۔ اس لئے آپ اپنے کچھ منتخب رشتہ داروں اور صحابیوں کے ساتھ جن کی تعداد عورتوں اور بچوں سمیت ڈیڑھ سو سے زیادہ نہ ہو گئی، کربلا آئے۔

دنیا جانتی ہے کربلا میں کیا ہوا؟ اور کس طرح اور کس طرح امام حسینؑ اور ان کے اصحاب اور ان کے اقرباء نے (جن میں چھ مہینے کا معصوم بچہ بھی شامل ہے)، ۱۰ محرم الحرام سنہ ۶۱ ہجری کو جام شہادت نوش فرمایا؟ کس طرح انہوں نے ۷ محرم سے ۱۰ محرم تک بھوک و پیاس کی شدت جھیلی؟ کس طرح ان کے خیموں کو جلایا گیا اور ان کے اثاث البیت کو لوٹا گیا؟ کس طرح ان کے اہل حرم کو جن میں عورتیں ایک بیمار بیٹا اور کئی چھوٹے چھوٹے بچے تھے اسیر کیا گیا؟ اور کس طرح کوفہ اور دمشق میں ابن زیاد ملعون اور یزید ملعون کے درباروں میں پیش کیا گیا؟ کس طرح انہوں نے ایک سال تک قید کی اذیت برداشت کی اور کیسے اس کے بعد رہا ہوئے؟ یہ سب حقیقتیں بالکل آشکارا ہیں۔ اور میں یہاں ان کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتا۔

امام حسینؑ نے امامت و سلطنت کی علیحدگی کو آخری شکل دے دی

امام حسینؑ شہید کر دیئے گئے۔ بظاہر یزید فاتح رہا لیکن صرف بظاہر ہے، دراصل یہ حسینؑ تھے جو فاتح رہے۔ اور انہوں نے اپنی کامیابی کی داستان کربلا کے ریگ زار پر اپنے پاک خون سے لکھی، ان کی اس کامیابی کے کئی رخ تھے لیکن یہاں مجھے صرف ایک کا تذکرہ کرنا ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا ہے، یزید لعین مسلم حکومت کا حکمران تھا۔ اور سابق کے تین خلفاء کے قائم کردہ اصول کے مطابق اس کا ہر عمل اسلام کا معیار اور مذہب کا حقیقی ترجماں سمجھا جانا چاہئے تھا۔

امام حسینؑ کے پاس ایسی کوئی سیاسی سند نہ تھی لیکن وہی واحد شخصیت ایسی تھی جو یزید لعین (سربراہ حکومت، بادشاہ) کے مقابلے میں آئے اور اسے "باغی" نہ کہا جاسکے کیونکہ ان کو خدا اور رسولؐ کی طرف سے ہر وہ سند حاصل تھی جو ان کے بڑے بھائی امام حسنؑ کو ملی تھی اور رسول مقبولؐ کی اس حدیث نے کہ "حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں" (ذخائر العقبی، امام الحرمین، مسند احمد بن حنبل، صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ، ارجح المطالب، عبیداللہ امرتسری، صحیح ترمذی، مشکوۃ المصابیح، ص ۵۶۳۔ اسد الغابہ، ابن اثیر)۔ اس بات کو ظاہر کر دیا تھا کہ حسینؑ کا ہر کام بذات خود رسولؐ کا کام ہے۔

اس لئے جب لوگوں کو سانحہ کربلا کا علم ہوا تو ان کا دل کسی طرح اس بات کو ماننے پر آمادہ نہ ہوسکا کہ حسینؑ غلطی پر رہے ہونگے کیونکہ حسینؑ کو غلطی پر کہنا (معاذاللہ) رسولؐ کو غلطی پر کہنے کے مترادف تھا اس لئے یزید لعین ساری اسلامی دنیا میں ہدف لعنت و ملامت بنا۔

اس طرح مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کا سلسلہ جو امام حسینؑ سے شروع ہوا، شہادت امام حسینؑ پر آکر مکمل ہوا۔ یہ ایک مسلسل کڑی تھی۔ امام حسنؑ کی صلح اور امام حسینؑ کی جنگ ایک دوسرے کا جزو لازم ہیں۔ اور ایک کو دوسرے سے الگ کر کے صحیح طریقہ سے سمجھنا ناممکن ہے۔

حدیث میں ہے کہ امام حسنؑ کے جسم کا بالائی حصہ اور امام حسینؑ کے جسم کا حصہ زریں رسول اکرمؐ سے مشابہ تھا۔ شاید خدا نے اسے اس امر کی علامت قرار دیا تھا کہ رسولؐ کا صحیح اور پورا مذہب جاننے کے لئے ان دونوں نواسوں کی زندگی کا ایک ساتھ مطالعہ ضروری ہے۔ ان دونوں بھائیوں نے مل کر اسلام کو ہمیشہ کے لئے حکمرانوں کی من مانی حرکات سے آزاد کرادیا۔

امام حسینؑ نے عوام کے سوچنے اور سمجھنے کی رو کو صحیح رخ پر موڑ دیا۔ حسینؑ کی شہادت کے بعد سے

سیاسی طاقت کا مطلب مذہبی اقتدار نہیں رہا۔ کربلا کے بعد دنیاوی حکمراں کا یہ منصب نہ رہا کہ اس کا عمل اسلامی قانون بن جائے۔ کوئی بھی شخص اجماع یا نامزدگی کے ذریعہ بادشاہ ہو سکتا ہے کوئی بھی شخص قہر و غلبہ کے ذریعہ تخت حکومت پر بیٹھ سکتا ہے لیکن عوام کا حاکم بن جانا اور ہے، مذہب کا رہنما بننا چیز دیگری ہے۔ اول الذکر کا سرچشمہ عوام ہیں اور آخر الذکر کا منبع خدا کی طرف سے ہے۔ امام حسینؑ نے بالآخر اسلامی دنیا کی آنکھ ہمیشہ کے لئے کھول دی۔

امام حسنؑ اور امام حسینؑ نے اسلام کو بادشاہوں کی غلامی سے نجات دلائی اور اس طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسے انحطاط و زوال سے بچالیا۔ بادشاہ آتے رہیں گے اور جاتے رہیں گے لیکن اسلام ہمیشہ باقی رہے گا۔ اور اسلام کے ساتھ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے مقدس نام بھی ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

حاجت کس کے سامنے رکھیں؟

شیخ ابو محمد حسن بن علی بن شعبہ صاحب کتاب "تحف العقول" نقل کرتے ہیں: انصار کا ایک شخص امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے اپنی حاجت طلب کرنا چاہتا تھا، امام نے اس سے فرمایا: "اے بھائی! اپنی عزت کا خیال رکھو، اپنی حاجت کو ایک کاغذ پر لکھو اور مجھے دو انشاء اللہ تمہیں راضی کروں گا"۔

اس آدمی نے لکھا: میں فلاں شخص کے پانچ سو دینار کا مقروض ہوں اور وہ اس کے واپس لینے میں اصرار کر رہا ہے۔ آپ سے تقاضا کر رہا ہوں کہ اس سے کہیں کہ مجھے اتنی مہلت دے جب تک میں آمادہ اس مقدار کو آمادہ کر لوں۔

جب امام حسینؑ نے اس کی لکھی ہوئی عرضی کو پڑھا تو فوراً گھر تشریف لے گئے اور ایک تھیلی اسے لاکر دیا جس میں ہزار دینار تھے اور فرمایا کہ: پانچ سو دینار سے اپنا قرض ادا کرو اور پانچ سو دینار کو اپنے پاس محفوظ رکھو تاکہ مشکلات میں تمہاری مدد ہو سکے۔ اور یاد رکھو اپنی حاجت کو اِن تین آدمیوں کے علاوہ کسی سے طلب نہ کرنا جن کو میں پہچنوا رہا ہوں: (۱) دیندار شخص، (۲) سخی اور اہل کرامت، (۳) وہ شخص جو شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ (تحف العقول، ص ۲۴۵)۔

اصحاب اور اہل بیت حسینی ؑ؛ معیار فضائل انسانی

▪ تحریر: حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا سید کاظم رضوی۔ بانی و مدیر بنیاد اختر تابان۔ قم

اگر خالص عرق گلاب کے چند قطرے پانی سے بھرے ایک جگ میں ڈال دئے جائیں تو باوجودیکہ جگ میں ہزاروں یا لاکھوں قطرے ہوتے ہیں مگر جگ کا پانی عرق گلاب کے ان چند قطروں سے متاثر ہو کر مہکنے لگتا ہے۔

یہی حال مومنین کا بھی ہے۔ مومنین اگر خلوص، معنویت، ایمان اور اخلاق سے معطر ہوں تو وہ اپنی تعداد کم ہونے کے باوجود اپنے اطراف کے ماحول کو متاثر کر کے اسے بھی اپنی معنویت، ایمان اور اخلاق سے معطر کر دیتے ہیں۔

اسی لئے ارشاد ہوتا ہے:

«كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ» (سورہ بقرہ، آیت ۲۴۹)۔ یعنی بسا اوقات چند ایک لوگ خدا کے حکم سے بہت سے لوگوں پر غالب آجاتے ہیں۔

اسی لئے مومنین کبھی بھی اپنی تعداد کی قلّت کی بنا پر ہار نہیں مانتے بلکہ اپنے کردار کی نیک تاثیر کی امید کے ساتھ وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف رہتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کو بھی اپنے جیسا بنالیں۔

کربلا والوں نے بھی اپنی کم تعداد کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سب سے عظیم کام جو انجام دیا ہے وہ: ذلت کو قبول نہ کر کے حق کی راہ میں آگے بڑھتے رہنے کا ہے اور آخر کار شہادت کے عظیم درجہ پر فائز ہو کر دنیا و آخرت کی سعادت کو حاصل کر لیا۔

امام حسینؑ خود اپنے عظیم ساتھیوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

"فَإِنِّی لا اَعْلَمُ اَصْحاباً اَوْلَی وَ لا خَیْراً مِنْ اَصْحابِی، وَ لاَ اَهْلَ بَیْت اَبَرَّ وَ لاَ اَوْصَلَ مِنْ اَهْلِ بَیْتِی»" (تاریخ طبری، ج۴، ص۳۱۷؛ بحار الانوار، ج۴۴، ص ۳۹۲)۔ "میں نے اپنے اصحاب سے بہترین دوست و ساتھی کسی اور کے لئے نہیں جانتا ہوں، اور اپنے اہل بیت سے زیادہ نیک اور رشتہ داری میں پابند رشتہ دار کو نہیں جانتا ہوں"۔

حضرت امام حسینؑ کے مذکورہ فرمان میں "لا اَعْلَمُ" (میں نہیں جانتا) آیا ہے اور یہ کوئی عام بیان نہیں، بلکہ علمی یقین اور حقیقی گواہی کا اظہار ہے۔ امامؑ نے یہاں اپنے علم اور مشاہدے کی بنیاد پر حتمی اور سچی

بات کا اظہار فرمایا ہے جس میں کسی قسم کا شک یا مبالغہ نہیں، بلکہ حقیقت کا اعلان ہے۔

اسی طرح "اَصْحابِی" (میرے ساتھی) کی روشنی میں وہ تمام وفادار جاں نثار شامل ہیں جو مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلا تک امامؑ کے ہمراہ رہے اور بالآخر شہادت پر فائز ہوئے۔اسی طرح وہ تمام صنف کے افراد شامل ہیں چاہے آزاد ہوں یا غلام، جوان ہوں یا بوڑھے، مرد ہوں یا خواتین سب اس میں شامل ہیں۔ جنہوں نے دین حق کی محبت اور امامؑ کی ولایت میں یکجا ہو کر اپنی قربانیاں پیش فرمائی۔

اسی طرح مذکورہ فرمائش میں اَوْلَی (زیادہ وفادار/ زیادہ حقدار) اور خَیْراً (زیادہ بہتر) جیسی عبارات کی روشنی میں اصحاب حسینؑ کی وفاداری اور اطاعت کے لحاظ سے بے مثال ہونے، حق و انصاف کے معاملے میں سب سے زیادہ بہتر ہونے، اپنے دینی و اخلاقی فرائض کی ادائیگی میں سب سے آگے ہونے، امامؑ کے ساتھ اپنے عہد و پیمان پر پورا اترنے اور اسی طرح ایمان، تقویٰ، شجاعت، سخاوت، ایثار، بھلائی، نیکی، فضیلت، اخلاق و کردار کے اعلیٰ ترین معیارات کے حامل ہونے جیسے صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔

امام حسینؑ نے مزید فرمایا: "وَ لاَ اَهْلَ بَيْت اَبَرَّ وَ لاَ اَوْصَلَ مِنْ اَهْلِ بَيْتِی" (میرے گھرانے کے لوگ جو میرے ساتھ ہیں، میں نے ان سے زیادہ کسی کو نیکی کرنے والا اور صلہ رحم (ساتھ نبھانے) والا نہیں پایا۔

حدیث کے ان جملات میں وہ مرد و خواتین شامل ہیں جو کربلا میں امام حسینؑ کے ساتھ تھے اور جن کا تعلق آپ کے اہل بیتؑ اور خونی رشتے سے تھا۔ یہ وہ مقدس ہستیاں ہیں جو نورِ امامت کا حصہ اور رسالت کے گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ امام معصومؑ نے ان کی صفات میں بھی سب سے زیادہ نیک کرنے، احسان و فرمانبرداری میں اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہونے، اپنے انسانی حقوق اور اخلاقی فرائض کی ادائیگی میں بے مثال ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔

امام حسینؑ کے اہل بیتؑ کا روشن کردار اور امام وقت سے ان کی والہانہ عقیدت اور بے مثال حمایت و نصرت کا کوئی نمونہ تاریخ نے بیان نہیں کیا ہے۔ انہوں نے مشکل ترین حالات میں بھی امام وقت کے ساتھ گہرا روحانی اور عملی تعلق قائم رکھا اور میدان شہادت میں اور شہادت کے بعد امامت کے پیغام کو زندہ رکھنے کا فریضہ اس طرح نبھایا کہ آج تحریک کربلا بلکہ حقیقی اسلام اور دین الٰہی کی زندگی انہیں کی مرہون منت ہے۔ اسی وجہ سے امام حسینؑ نے فرمایا کہ میرے اہل بیتؑ جیسے کسی کے اہل بیتؑ نہیں ہیں۔

امام حسینؑ کا یہ مختصر مگر نہایت عمیق فرمان ہے۔ کربلا کے ان بے مثال شخصیتوں کی تعریف ہے

جنہوں نے اپنی وفاداری، بہترین اخلاق، نیکی اور رشتہ داری کے حقوق کی مکمل ادائیگی سے تاریخ میں ایک ایسا معیار قائم کیا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ فرمان ان مقدس ہستیوں کی عظمت کی دائمی سند ہے اور ہر دور کے انسانوں کے لیے وفا اور تقویٰ کی اعلیٰ ترین مثال پیش کرتا ہے۔اور امام حسینؑ نے یہ فرمان میدان کربلامیں اپنے اصحاب اور اہل بیتؑ کی بے مثال قربانیوں کے مشاہدہ کے بعد فرمایا تھا لہٰذا یہ صرف ایک سادہ تعریف نہیں ہے بلکہ تاریخ کے سامنے ایک گواہی اور ان جاں نثاروں کے مقام و مرتبے کا اعلان بھی ہے تاکہ اصحاب اور اہل بیت حسینیؑ کو انسانی تاریخ کا معیارِ فضیلت قرار دیا جائے۔ اور دین و امام معصومؑ کی بہ نسبت وفاداری، اخلاص، تقویٰ، صبر اور رشتہ داری، محبت، احترام وغیرہ میں کربلا والوں سے نزدیک تر ہو۔

خلاصہ یہ کہ اصحاب و اہل بیت حسینیؑ تعداد میں بھلے ہی بہت کم تھے لیکن رہتی دنیا تک تمام انسانی اور اخلاقی فضائل کے لئے معیار و میزان بن گئے۔

پروردگار عالم سے دعا ہے کہ ہم تمام عزاداروں کو اصحاب و اہل بیت حسینیؑ سے نزدیک رہنے اور ان کے کردار و فضائل کو اپنانے کی توفیق مرحمت فرمائے (آمین)۔

سفینہ نجات

حضرت امام حسینؑ اور کربلاوالوں کی داستان آج بھی ہدایت و گمراہی کے لئے اہم حد فاصل ہے، جو شخص کشتی حسینیؑ میں سوار ہو جاتا ہے وہ ہدایت پا جاتا ہے اور جو اس کشتی میں سوار نہیں ہوتا ہے وہ گمراہ رہتا ہے، معصومینؑ میں، امام حسینؑ نجات کے لئے اہم ترین ذریعہ ہے۔ چنانچہ امام صادقؑ فرماتے ہیں:

«کلنا سفن النجاۃ لکن سفینۃ جدی الحسین ؑ اوسع و فی لجج البحار اسرع»

"ہم سب کے سب نجات کی کشتیاں ہیں لیکن ہمارے جد امام حسینؑ بہت وسیع کشتی کے مانند ہیں اور سمندر کی امواج سینے پر تیزی اور سرعت سے بڑھنے والی کشتی کی طرح ہیں"۔ (بحار الانوار، ج ۲۶، ص ۳۲۲)۔

عزاداری کا عبادی اور جہادی پہلو آیۃ اللہ جوادی آملی کی نظر میں

▪ ترجمہ و ترتیب: ڈاکٹر باقر ایلیار ضوی۔ معلم جامعۃ المصطفیٰ (ص) العالمیہ۔ قم

عزاداری کے ایام میں جب ہم ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں تو ایک دوسرے کو دعا دیتے ہیں، عزاداری کی قبولیت اور امام حسینؑ کے قاتلوں سے بدلہ لینے کے لئے دعا کرنا ہوتا ہے اور یہ ہماری عزاداری کا ایک اہم نعرہ ہے:

"اعظم الله اجورنا و اجورکم بمصابنا بالحسین(علیه السلام) و جعلنا و ایّاکم من الطالبین لثاره"۔ یعنی خدا ہمیں عزاداری امام حسینؑ کے بدلے بہترین اجر عنایت فرمائے اور ہم کو آپ کے قاتلوں سے بدلہ لینے والوں میں شمار کرے۔

آیۃ اللہ جوادی آملی اپنے درس اخلاق میں مذکورہ نعرے کی اہمیت اور اس کے دو اہم پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہم مسلمانوں کا یہ بنیادی نعرہ دو حصوں پر مشتمل ہے ایک یہ کہ ہم جو عزاداری برپا کرتے ہیں اور ضروری ہے کہ اسے برپا کریں، اسے خدا اپنی بارگاہ میں قبول کرے یہ اسکا عبادی پہلو ہے اور دوسرا اسکا جہادی پہلو ہے یعنی خدا ہمیں یہ توفیق دے کہ ہم حسینؑ بن علیؑ کے خون کا انتقام لیں "ثار" یعنی خون کا بدلہ نہ کہ خون- خدا ہمیں یہ توفیق دے کہ ہم اہل قیام و استقامت بنیں اور امام حسین کے خون کا بدلہ لیں یہ ہمارا بنیادی نعرہ ہے، پہلے جملے کا معنی واضح ہے، عزاداری امام حسین کو قائم کرنا عبادت ہے، ضروری ہے حلال مال سے ہو، قصد قربت سے ہو۔ خدا سے دعا کریں کہ ہم اس عزاداری کو قائم کریں اور خدا بھی اسے قبول کرے یہ پہلے جملے کا معنی ہے"۔

اور دوسرے جملے کا معنی کیا ہے؟ خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم امام حسین کے خون کا بدلہ لیں۔ واقعہ کربلا میں بعض قاتلین تھے اور بعض وہ جنہوں نے بعنوان توابین بعد میں قیام کیا قیام مختار اور دیگر افراد کا قیام۔ بعض قاتلین کربلا کو دردناک عذاب میں مبتلا کر کے قتل کیا اور بعض دوسرے عذاب الہی کی بنا پر واصل جہنم ہوئے، ابھی ان میں سے کوئی بھی روئے زمین پر باقی نہیں رہا پس یہ جو ہم خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ ہمیں امام حسینؑ کے خون کا طالب قرار دے یعنی کیا؟ یہ ایک سوال۔

اور دوسرا سوال یہ کہ اسکا ہم سے کیا ربط ہے؟ (آیہ و حکم قرآنی ہے کہ) "**من قُتِل مظلوماً فقد جعلنا لولیّہ سلطانا**"، جو بھی مظلوم مارا جائے اسکے ورثاء خون کا بدلہ لیں گے، (پس انتقام خون حسینؑ کا مسئلہ) ہم سے کیسے مربوط ہوگا؟ ہم خون کا بدلہ لینے کے طالب ہیں؟۔

یہ دو سوال ہمارے رسمی نعروں میں پائے جاتے ہیں۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ امام حسینؑ کے واقعہ کی بازگشت انکی حقیقی شخصیت کے بجائے قانونی شخصیت کی طرف ہوتی ہے۔ امام حسین حقیقی شخصیت کے لحاظ سے دوسرے بیٹوں کی مانند امام علی کے فرزند ہیں ایک عادی انسان ہیں جن پر "**كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ**" (ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے) کا حکم لاگو ہوتا ہے۔ لیکن ایک بعنوان امامت انکی قانونی شخصیت ہے آپ نے حسین بن علی ہونے کے لحاظ سے جنگ نہیں کی بلکہ فرزند رسول اور امامت کے دعویدار ہونے کے عنوان سے جنگ لڑی۔ بنا بریں دشمن شخص امام کے بجائے امامت سے برسر پیکار تھے اور امام نے مدینے میں یہی فرمایا تھا کہ جب یزید حاکم بن گیا ہے تو اسلام کا فاتحہ پڑھ دینا چاہیے:

«بعد الاسلام السلام اذ بليت الامّة برا عٍ مثل يزيد»؛

(امامؑ کے اس بیان میں) یزید ایک مثال ہے یعنی اس میں یزید کی کوئی خصوصیت نہیں جو بھی یزیدی فکر رکھتا ہو امام حسینؑ کے بجائے جو بھی مقام امامت کا مالک ہو اس کیلئے خصوصیت رکھتا ہے۔ خود امام نے فرمایا کہ جب حکمران یزیدی سوچ کے مالک بن جائیں جیسا کہ آپ تیونس، مصر، لیبیا، یمن، بحرین اور سعودی عرب کے بعض علاقوں میں آج سب دیکھ رہے ہیں۔ پس امام نے فرمایا کہ اگر یزید کی طرح کا کوئی حاکم بن جائے تو اسلام باقی نہیں بچے گا۔

پس ان دو نکات کی بنا پر ایک یہ کہ امام حسینؑ کی قانونی شخصیت انکی امامت کی طرف پلٹتی ہے دوسرا یہ کہ امام نے ہم مسلمانوں کا فریضہ تا روز قیامت معین کر دیا ہے کہ اگر کوئی حاکم یزید کی طرح ہو جائے تو خاموش نہیں بیٹھنا چاہیے اس بنا پر امامت اور شہید کے خون کا بدلہ لیا جا سکتا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ہم ہی کیوں امام کے خون کا بدلہ لیں؟ (جواب یہ ہے کہ) اس لیے کہ ہم امام حسینؑ کی (معنوی) اولاد ہیں، ہمارے باپ کو شہید کیا گیا ہے۔ چنانکہ رسولؐ نے فرمایا کہ:

"أنا و علي ابو اهذه الامّه"

میں اور علیؑ اس امت کے دو باپ ہیں۔ پس نبیؐ نے سب کو بتلا دیا کہ اے لوگو! تمہارے ایک نسبی والدین ہیں جنکا نام تمہارے شناختی کارڈ میں درج ہے

اور ایک معنوی والدین ہیں آؤ ہم تمہیں اپنی فرزندی میں قبول کرتے ہیں ہم نے بھی تسلیم کرلیا، ہم شیعہ ہوگئے اور ان بزرگواروں کو بعنوان امام تسلیم کیا اب اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ تمہاری ماں کون ہے؟ جواب ہوگا : فاطمہ زہراؑ اور باپ کون ہے؟ علی بن ابی طالبؑ۔ اگر ہمارے باپ کو شہید کیا جائے تو تا روز قیامت اسکے خون کا بدلہ لینے کے طالب ہیں۔

آیت اللہ جوادی آملی مزید عزاداری کے حوالے سے فرماتے ہیں: آپ دیکھتے ہیں کہ سبھی ان ایام میں بالخصوص روز عاشورا اسطرح سر وسینے پر ماتم کرتے ہیں اسلیے ہے کہ انکے باپ کو شہید کیا ہے۔ رسول [ص] نے فرمایا کہ ہمارے بیٹے بن جاؤ تو ہم نے بھی قبول کرلیا۔ لہٰذا جب ہمارے باپ کو شہید کیا تو تاروز قیامت ہم انکے خون کا بدلہ لینے کے طالب ہیں۔ پس یہ نعرہ ہمارا فریضہ بھی ہے ایام عزاداری میں ایک دوسرے سے کہیں:

«اعظم الله اجورنا و اجورکم بمصابنا بالحسین(ع) و جعلنا و ایاکم من الطالبین لثاره».

یہ اس وجہ سے ہے اور شکر گزار ہیں کہ ہم صالح فرزند ہیں۔

آیۃ اللہ جوادی آملی مزید جہادی پہلو کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: جہاد کی تین قسمیں ہیں۔ جہاد اصغر، جہاد اوسط اور جہاد اکبر- امام حسینؑ نے تینوں اقسام کو انجام دیا، بعض لوگ دو قسموں کے جہاد کو انجام دیتے ہیں، اور بعض لوگ ایک ہی جہاد کو انجام دے پاتے ہیں؛ جہاد اصغر یہ کہ انسان دشمن سے لڑے، اس میں استعمال ہونیوالی چیز لوہا ہے، جہاد اوسط میں انسان اپنے نفس اور خواہشات سے لڑتا ہے یہاں لوہے کا کام نہیں بلکہ گریہ وزاری کام آتی ہے چنانچہ دعائے کمیل میں پڑھتے ہیں:

«و سلاحه البکاء»؛ یعنی خدایا نفس، ہوا ہوس اور شیطان کے مقابلے کیلئے ہمارا اسلحہ صرف گریہ ہے، ایک مغرور انسان فریب کھاجاتا ہے لیکن ایک متواضع اور فروتن انسان دھوکہ اور فریب کا شکار نہیں ہوتا۔ جہاد اوسط میں ہمارا اسلحہ خدا کی بارگاہ میں گریہ وزاری ہے۔

سید الشہداء تینوں قسم کے جہاد کے مالک تھے، جہاد اصغر بھی کہ دشمنوں سے برسر پیکار ہوئے، جہاد اوسط بھی کہ اپنے نفسانی اوصاف سے بھی جنگ کی عادل امام تھے اور جہاد اکبر بھی آپ نے انجام دیا جس کو عام طور پر بیان نہیں کیا جاتا اور اسی جہاد اوسط کو ہی اکبر کا نام دیا جاتا ہے جبکہ نفس کے ساتھ جنگ، تہذیب نفس، تزکیہ نفس، انسان کا عادل ہونا، متقی اور جنتی ہونا یہ سب جہاد اوسط ہے نہ کہ جہاد اکبر۔

جہاد اکبر اس کیلئے ہے جو جہاد اوسط کے محاذ پر کامیاب رہا ہو یعنی ایسا انسان جو عادل، متقی، وارستہ،

اہل تہجد، پاک و منزہ اور اہل بہشت ہو لیکن چاہتا ہو کہ جہاد اکبر میں شریک ہو اور جہاد اکبر یہ ہے کہ انسان جدوجہد کرے یہیں سے جنت اور جہنم کا مشاہدہ کرے، اگر کوئی سعی کرے کہ جنتی بن جائے تو یہ جہاد اوسط میں ہے اور مسئلہ اخلاق، تہذیب نفس سے مربوط ہے لیکن اگر جنت و جہنم کو دیکھنے کی سعی کرے تو یہ جہاد اکبر ہے یہ یا تو اصلا بیان نہیں ہوتا یا کسی کتاب کے ایک گوشے میں کسی ایک صاحب نظر کیلئے بیان ہوتا ہے اور اسے کسی بھی طرح سے شمار نہیں کیا جاتا لہٰذا جہاد اوسط کو ہی جہاد اکبر کہا جاتا ہے۔ جہاد اکبر یہ کہ انسان جنت کا مشاہدہ کرے اور امام حسین جنت کا مشاہدہ فرمارہے تھے اور شب عاشور میں بعض کو دکھایا بھی تھا۔ ان کا شب عاشور میں امتحان لینے کے بعد فرمایا کہ اے لوگو! یہاں موت کے علاوہ کچھ نہیں ہے میں تمہیں بتارہا ہوں کہ نہ تو ہم صلح کریں گے اور نہ ہی وہ راضی ہونگے جو بھی یہاں رہے گا مارا جائے گا مبادا یہ مت کہنا کہ ہمیں معلوم نہ تھا اور میں تمہارے زمانے کا امام ہوں اور تمہاری گردنوں سے اپنی بیعت اٹھارہا ہوں، ابھی رات ہے اگر جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ، کربلا کا راستہ (دشمنوں کی طرف سے) بند ہے مگر یکطرفہ نہ کہ دوطرفہ یعنی جو بھی میری مدد کو آنا چاہے اسکا راستہ روکیں گے لیکن اگر کوئی ہمیں چھوڑ کر جانا چاہے تو اسکے لیے راستہ کھلا ہے، آنا منع ہے نہ کہ جانا، آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ان تمام مراحل میں راستہ بند ہے مگر یکطرفہ طور پر، نہر فرات جسے بہت سارے تیر اندازوں نے بند کر رکھا ہے صرف امام حسینؑ اور انکے ساتھیوں کیلئے ہی نہیں تھا کہ پانی نہ لیں بلکہ پانی کا راستہ بھی بند کیا ہوا تھا کیونکہ فرات کے اس کنارے پر پہت سارے دیہات تھے، یہ فرات ایک نہر ہے جو دریائے دجلہ سے جدا ہوکر کربلا کے شمال مشرق میں آتی ہے اس نہر کے اس پار بہت سارے دیہات تھے ممکن تھا کہ وہ پانی امام اور انکے ساتھیوں تک پہنچا دیں، یہ ایک گذرگاہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا یہاں سے رفت وآمد آسان تھی وہاں پر تیر انداز بٹھائے گئے کہ تم اس اہم نہر کے محافظ ہو اس میں بعض ایسی جگہیں ہیں جن سے آنا جانا آسان نہیں ہے جبکہ بعض دوسری جگہوں پر جہاں ایک طرف نرم جھاڑیاں ہیں وہاں سے آیا جا سکتا ہے اسے شرعہ اور شریعہ کہا جاتا ہے یہاں سے رفت وآمد ہو سکتی ہے اس مقام پر تیر اندازوں کا پہرا بٹھا دیا کہ مبادا کوئی اس شریعہ سے اندر آئے آپ مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ اس اہم نہر پر بھی پہرا تھا کہ کوئی پانی کے راستے کربلا نہ آئے اور امام حسینؑ کی مدد نہ کرے آپ نے شب عاشور فرمایا کہ جانا آسان ہے رات بھی ہے کوئی تمہیں دیکھ بھی نہیں سکتا بیعت بھی تمہاری گردن سے اٹھالی ہے جو بھی رہے گا مارا جائے گا کوئی بھی

زندہ باقی نہیں بچے گا حتی کہ یہ شیر خوار بچہ بھی شہید ہوگا یہ فرمایا تو حضرت قاسمؑ نے عرض کی چچا جان یہ خیام میں آجائیں گے فرمایا جب تک میں زندہ ہوں خیام داخل نہیں ہوسکتے۔ عرض کی کہ یہ شیر خوار بچہ تو چل کر میدان نہیں جائے گا اسے کیسے شہید کریں گے فرمایا:

''اذا جفّت روحه عطشا''؛

جب جگر مکمل طور پر کباب اور لب خشک ہو جائیں گے تو کہوں گا ''ولّونی'' مجھے لادو میں اسے سیراب کرتا ہوں اس موقعہ پر تیر آئے گا اور میری گود میں ذبح ہو جائے گا۔

امامؑ کے یہ فرمانے کے بعد کہ مطمئن رہو یہاں صرف موت ہے اور یہ فقط مجھ سے سروکار رکھتے ہیں تم سے انہیں کوئی کام نہیں اگر جانا چاہتے ہو تو آزاد ہو یہ شب عاشور میں فرمایا۔ سب سے پہلے جو شخص کھڑا ہوا اور کہا ممکن نہیں کہ ہم آپ کو تنہا چھوڑ دیں، قمر بنی ہاشم تھے، عباسؑ بن علیؑ تھے جو کھڑے ہوئے پھر تمام شہداء نے باری باری عرض ادب کیا اور کہا کہ ہم آپ کو کسی صورت تنہا نہ چھوڑیں گے۔ قاسمؑ نے عرض کی کل میں بھی شہید ہونگا فرمایا موت کو کیسا پاتے ہو؟ تو عرض کی کہ:

''احلي من العسل''

فرمایا ہاں تو بھی شہید ہوگا۔ بنابریں جب یہ واقعہ اپنے اختتام کو پہنچا اتمام حجت ہوئی معلوم ہوا کہ جہاد اصغر کا مرحلہ سر کر رہے ہیں جہاد اوسط کو سر کر چکے ہیں پھر جہاد اکبر میں داخل کیا اور انہیں جنت دکھائی بنابریں جہاد اکبر یہ نہیں ہے کہ انسان ایمان رکھتا ہو کہ جنت و جہنم ہے، جہاد ہے، جہاد اکبر یعنی حلال مال اور حلال سوچ اور حلال غذا، نماز تہجد اور روح کی طہارت میں اتنی کوشش کرے کہ خدا کے علاوہ کچھ نہ سوچے تاکہ جہنم و جنت کو دیکھے۔

والسلام مع الاکرام

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

«ہم پر جو ستم ڈھائے گئے ہیں ان پر آہ کرنا تسبیح ہے، ان پر غم کرنا عبادت ہے اور ہمارا راز پوشیدہ رکھنا راہ خدا میں جہاد ہے پھر فرمایا: "میری اس بات کو آب طلا سے لکھ لینا چاہئے"»۔

(نفس المہموم، ص ۱۷)۔

مقصد عزائے امام حسینؑ

• تحریر: حجۃ الاسلام مولانا عابد رضا نوشاد رضوی۔ طالب علم جامعۃ المصطفیٰ (ص) العالمیہ۔ قم

مقدمہ

امام کے مقصد قیام سے مختلف نہیں ہے۔ ائمہ معصومینؑ کی سیرتِ عزا سے یہی نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔ جن اغراض و مقاصد کے تحت امام عالی مقام نے قیام کیا اور بارگاہ رب العزت میں نذرانۂ جاں پیش کیا، مجموعی طور پر وہی اغراض و مقاصد عزاداری کے بھی ہیں۔ چنانچہ اگر امام حسینؑ نے اسلام کے احیاء، انسانی اقدار کے تحفظ، قرآن کے دفاع، سنت کی ترویج، بدعت کے خاتمے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نفاذ کے لئے قیام فرمایا تھا تو آپ کی یاد و عزا کو بھی انہی اغراض و مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہونا چاہئے۔ جس عزاداری میں یہ عظیم اغراض و مقاصد نہ پائے جاتے ہوں وہ عزائے امام حسینؑ پر مکمل طور پر منطبق نہیں ہو سکتی۔

امام جعفر صادقؑ، سید الشہداءؑ کی زیارت اربعین میں آپ کے مقصد قیام کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «لِيَسْتَنْقِذَ عِبَادَكَ مِنَ الْجَهَالَةِ وَ حَيْرَةِ الضَّلَالَ»؛ (تہذیب الاحکام، ج۶، ص ۱۱۳)۔

"اے اللہ! انہوں نے تیرے بندوں کو جہالت و گمراہی سے نجات دینے کے لئے قیام کیا۔"

لہٰذا ضروری ہے کہ مجالس و مراسم عزا میں بھی یہی اثر پایا جائے اور آپ کا تذکرہ یوں کیا جائے کہ عالم انسانیت کے لئے چراغ ہدایت قرار پائے۔ امام محمد باقرؑ بھی فرماتے ہیں:

«إِنَّ فِي اجْتِمَاعِكُمْ وَ مُذَاكَرَتِكُمْ إِحْيَاءَنَا وَ خَيْرُ النَّاسِ بَعْدَنَا مَنْ ذَاكَرَ بِأَمْرِنَا وَ دَعَا إِلَى ذِكْرِنَا» (وسائل الشیعۃ، ج ۱۶، ص ۳۴۸ ، باب استحباب تذاکر فضل الائمۃ)۔

تمہارے اجتماعات و مذاکرات میں ہمارا (ہماری سیرت کا) احیاء ہوتا ہے اور ہمارے بعد لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو ہمارے امر کا تذکرہ کرے اور لوگوں کو ہمارے ذکر کی طرف دعوت دے۔

مجالس و محافل اور ذکر اہل بیت اطہارؑ کے سلسلے میں ایسی تمام روایات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ان مجالس و محافل کا مقصد خالص اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و ترویج ہے جو اہل بیت اطہارؑ کی سیرت و کردار اور احکام و فرامین کے ذکر کے ذریعہ قابل حصول ہے۔

عصر غیبت کے بعد علماء کی سیرت بھی یہی رہی، چنانچہ انہوں نے بھی با مقصد عزاداری کا سلسلہ جاری رکھا۔ صرف عزاداری برائے عزاداری نہیں کی بلکہ اسے کربلائی تہذیب و ثقافت، اصل اسلامی تعلیمات اور علوم محمد وآل محمدؐ کی تبلیغ وترویج کا ذریعہ بنایا تاکہ دنیا میں اسلامی وانسانی اقدار کو تحفظ فراہم ہو سکے۔

عزائے سید الشہداءؑ معاشرہ کی حیات کا سبب

تاریخی واقعات ہر معاشرہ کی تہذیب و ثقافت پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ ان واقعات سے حاصل ہونے والے سبق، عبرتیں اور تجربے قوموں کا عظیم سرمایہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس سرمایہ کی حفاظت اور اس کا احیاء ضروری ہے، اس لئے کہ ان واقعات سے معاشرہ کی حیات وابستہ ہوتی ہے۔

ان تمام واقعات میں انقلاب کربلا ایک عظیم اور نمایاں حیثیت کا حامل نظر آتا ہے۔ قیام کربلا بظاہر نصف روز کے اندر شروع ہو کر ختم ہو جانے والا ایک تاریخی واقعہ ہے لیکن یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اس کے اعلیٰ الٰہی و انسانی مقاصد و پیغامات اس کی جاودانی کا سبب بنے ہیں۔ یہ وہ پیغامات ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر عالم انسانیت اپنے مطلوبہ کمال تک پہنچ سکتا ہے۔

کربلا صرف ایک جغرافیا کا نام نہیں بلکہ ایک الٰہی مکتب، مقدس آئیڈیالوجی اور انسانیت کو فروغ دینے والی روحانی یونیورسٹی ہے جہاں سے عزت و سربلندی، حریت و آزادی، عدل و انصاف اور مخالفت ظلم و استکبار کا درس ملتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ تمام دیگر تاریخی واقعات و انقلابات کے برخلاف چودہ صدیاں گذر جانے کے باوجود کربلا آج بھی زندہ ہے اور تا قیامت اس کے سنہرے مقاصد و پیغامات اس کی بقا کے ضامن ہیں۔

جب اموی حکومت کی بربریت، ناانصافی اور جنایات اپنے عروج پر پہنچیں اور امام حسینؑ نے روح اسلام، قرآن اور انسانیت کو رفتہ رفتہ نابودی کی طرف جاتے دیکھا تو آپ نے ان حالات کے خلاف قیام کرنا ناگزیر پایا اور پھر اپنے لہو سے جبین اسلام پر کربلا نامی ایک ایسی عبارت تحریر کر دی جو تا قیام قیامت عالم انسانیت کو اصل اور خالص اسلام سے روشناس کراتی رہے گی۔

اگر کربلا نسل در نسل اپنی اصل شکل و صورت کے ساتھ منتقل ہوتی رہے تو یہ عظیم قربانی انسانی معاشرہ کو حیات عطا کرتی رہے گی۔ لیکن خدانخواستہ اگر اسے فراموشی کے سپرد کیا گیا اور اس کی اصل حیثیت اور مقاصد و پیغامات میں تحریف کی گئی یا اس میں اوہام و خرافات کی آمیزش کی گئی تو نقصان بھی انسانی معاشرہ کا ہی ہوگا۔ ائمہ معصومینؑ نے عزائے امام حسینؑ کے انعقاد پر جو اسقدر تاکید کی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ کربلا نامی انسان سازی کا یہ الٰہی مکتب

ہر زمانہ میں معاشرہ کے بجھتے وجود میں روح حیات پھونکتا رہے اور شمشیر پر خون کی فتح، ظلم پر عدل کی جیت اور باطل پر حق کی کامیابی کی یہ داستاں قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے مشعل فروزاں ٹھہرے۔

ائمہ معصومینؑ نے لوگوں کو بھی عزائے امام حسینؑ کے انعقاد کی دعوت دی ہے اور خود بھی مجالس عزا منعقد کی ہیں۔

امام سجادؑ کربلا کے بعد جب تک زندہ رہے واقعہ کربلا کو یاد کر کے روتے رہے اور اتنا روئے کہ آپ کا شمار "بکّائین" یعنی بہت زیادہ گریہ کرنے والوں میں ہوا۔ آپ کے گریہ کا یہ عالم تھا کہ جب بھی آپ کے سامنے پانی لایا جاتا تھا تو کربلا والوں کی تشنہ لبی کو یاد کر کے گریہ فرماتے تھے (صدوق، خصال، ج ۱، ص ۱۳۱)۔

امام محمد باقرؑ بھی عزائے سید الشہداء کا انعقاد کرتے تھے اور دوسروں کو بھی اس عمل کی تاکید فرماتے تھے۔ ایک مجلس عزا میں کمیت نے نوحہ پڑھا تو امام نے بہت گریہ فرمایا اور انہیں دعائیں دیں (شیخ طوسی، مصباح المتہجد، ص ۷۱۳)۔

امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے ہیں کہ جب ماہ محرم آتا تھا تو پھر میرے بابا امام جعفر صادقؑ کبھی ہنستے نہیں تھے بلکہ آپ پر غم و اندوہ کے آثار نمایاں رہتے تھے اور آپ کے رخسار آنسوؤں سے تر ہو جاتے تھے، یہاں تک کہ روز عاشورا آپ کا یہ غم شدید ہو جاتا تھا اور مسلسل رو کر فرماتے تھے یہ وہ دن ہے جس میں میرے جد حسینؑ بن علیؑ کو شہید کر دیا گیا۔

ہمارے تمام ائمہ معصومینؑ نے عزائے سید الشہداءؑ کو بے پناہ اہمیت دی ہے۔ ان ذوات مقدسہ کی یہ سیرت اس بات کا سبب بنی کہ چودہ صدیاں گذر جانے کے باوجود عزائے امامؑ ایک زندہ تحریک کی صورت میں انسانی معاشرہ کو مسلسل حیات عطا کر رہی ہے اور اپنے روحانی پیغامات سے تشنگان روحانیت کو سیراب کر رہی ہے۔

ظاہر ہے کہ اہل بیت اطہارؑ یا خود امام حسینؑ ہمارے انعقاد عزا کے محتاج نہیں ہیں۔ اگر معصومینؑ نے عزائے اہل بیتؑ کے انعقاد کی تاکید کی ہے تو اس کا سبب وہ آثار و برکات اور فوائد و نتائج ہیں جو اس کے ذریعہ انسانی معاشرہ کو نصیب ہوتے ہیں۔

منجملہ:

۱۔ انسانی اقدار کی حفاظت

کربلا کے پیغامات صرف مسلمانوں یا پیروان اہل بیتؑ کے لئے ہی نہیں بلکہ پورے عالم انسانیت کے لئے ہیں۔ حریت و آزادی، عدل و انصاف کا قیام، ظلم کی مخالفت، مظلوموں کی حمایت، اچھائیوں کی ترویج، برائیوں کا مقابلہ ... یہ وہ عظیم پیغامات ہیں جن کے

لئے امام حسینؑ نے اپنی، اپنے اہل و عیال اور اصحاب و انصار کی قربانی پیش کی ہے تاکہ قیامت تک انسانی اقدار کی حفاظت ہوتی رہے۔

عہد حاضر میں ہر طرف ظلم و بربریت اور ناانصافی کا بول بالا ہے، جہاں دیکھئے نفرت کی ایک آگ لگی ہوئی ہے، بے گناہوں کے خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے، ایک دوسرے کے حقوق بڑی آسانی سے پامال کئے جا رہے ہیں، چاروں سمت تباہی کا ایک ایسا وحشتناک منظر ہے کہ انسانیت خون کے آنسو رونے پر مجبور ہے۔ ایسے حالات میں امام حسینؑ کے ان پیغامات پر عمل پیرا ہونے اور انہیں مشعل راہ قرار دینے کی سخت ضرورت ہے تاکہ کربلا سے الہام لیتے ہوئے سماج کی ہر برائی اور ہر ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھائی جائے، تحریک چلائی جائے اور یوں اپنی بیداری، زندہ دلی اور پاکیزہ انسانیت کا ثبوت بھی دیا جائے۔

جس طرح امام حسینؑ کا مقصد صرف مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ پورے عالم انسانیت کو ظلم و ستم سے نجات دے کر دنیا میں عدل و انصاف قائم کرنا تھا، اسی طرح ہمیں بھی بلا تفریق مذہب و ملت اور سرحدوں کا لحاظ کئے بغیر ہر مظلوم کو اس کا حق دلانے اور ظالم کی مخالفت میں کوشاں رہنا ہوگا۔ اس لئے کہ کربلا سب کی ہے اور اس کا پیغام سب کے لئے ہے۔ امام حسینؑ اور کربلا کی اسی آفاقی حیثیت کے بموجب دنیا بھر کی متعدد ظلم مخالف تحریکوں اور انقلابات کے بانیوں نے بھی امام کے قیام کو ہی اپنا آئیڈیل مانا اور آج بھی امام حسینؑ مذہب و ملت کی قید کے بغیر کروروں دلوں میں بستے ہیں۔

خاور صدق و صفا، داور ایثار حسین
کل جہاں قافلہ و قافلہ سالار حسین
جوشؔ ملیح آبادی

۲۔ اتحاد

کربلا اتحاد کا مرکز و محور ہے۔ جہاں ہر مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے مسلمان اپنا سر تعظیم خم کرتے ہیں۔ امام حسینؑ کے قیام کا ایک عظیم مقصد اصل اسلامی شریعت اور محمدی تعلیمات کی حفاظت کر کے دین کو بدعات و خرافات سے بچانا تھا تاکہ امت مسلمہ حقیقی معنوں میں امت محمدؐ رہے، شریعت محمدیہ بے روح نہ ہو، امت مسلمہ تفرقہ کا شکار نہ ہو اور اسلامی تعلیمات میں تحریف اور بدعات و خرافات کو شامل کر کے مسلمانوں کو مرکز و محور توحید سے جدا نہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہر قوم کی پکار حسین ہیں۔

در حسینؑ پہ ملتے ہیں ہر خیال کے لوگ
یہ اتحاد کا مرکز ہے آدمی کے لئے

اگر کربلا مرکز اتحاد ہے تو عزائے سید الشہداء کو بھی مرکز اتحاد باقی رہنا چاہئے اور اس کے ذریعہ عزاداران امام حسینؑ کو امن و سلامتی اور اخوت و

برادری کا پیغام عام کرنا چاہئے۔ عزاداری کا یہ ایک عظیم مقصد بھی ہے اور پیغام بھی جس سے غافل ہونا مقصد عزا سے انحراف کے مترادف ہے۔

۳۔ سیرت و کردار معصومینؑ سے آشنائی

مجالس عزا دینی تعلیمات کی تبلیغ و ترویج کا مرکز ہیں۔ ان مجالس میں محمد و آل محمدؐ کے فضائل اور ان کی پاکیزہ سیرت کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اہل بیت اطہارؑ کہ جو اللہ تک پہنچنے کا اکلوتا ذریعہ ہیں، ان کی سیرت و کردار پر عمل پیرا ہو کر ہی اصل اسلام سے آشنائی و آگاہی میسر آ سکتی ہے۔ یہ مجلسیں وہ عظیم اجتماعی سرمایہ ہیں جن کی بدولت ہمارا معاشرہ سیرت و کردار معصومینؑ سے فیضیاب ہو کر دنیا و آخرت میں سعادت و کامرانی حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس ذکر سے اہل بیت اطہارؑ سے روحانی قرب بھی حاصل ہوتا ہے کہ جسے یہ قرب حاصل ہو جائے وہ یقیناً نجات یافتہ ہے۔

۴۔ اصلاح معاشرہ

امام حسینؑ نے مدینہ سے ہجرت کرتے وقت اپنے بھائی حضرت محمد حنفیہؒ سے مقصد قیام کو یوں بیان فرمایا تھا:

«وَ أَنِّي لَمْ أَخْرُجْ أَشِراً وَ لَا بَطِراً وَ لَا مُفْسِداً وَ لَا ظَالِماً وَ إِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْإِصْلَاحِ فِي أُمَّةِ جَدِّي أُرِيدُ أَنْ آمُرَ بِالْمَعْرُوفِ وَ أَنْهَى عَنِ الْمُنْكَرِ وَ أَسِيرَ بِسِيرَةِ جَدِّي وَ أَبِي عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ» (بحار الانوار ج ۴۴ ص ۳۳۰)۔

میں ہوس یا خود پسندی کی بنیاد پر اور فساد و ظلم پھیلانے کے لئے نہیں نکلا ہوں بلکہ میں اپنے نانا رسول اللہؐ کی امت کی اصلاح کے لئے جا رہا ہوں۔ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنا چاہتا ہوں اور اپنے نانا اور بابا علی بن ابیطالبؑ کی سیرت پر چلنا چاہتا ہوں۔

ابتدائے قیام میں ہی امام نے واضح فرما دیا کہ میرا مقصدِ قیام، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، سیرت پیغمبر اکرمؐ اور سیرت حضرت امیر المومنینؑ کے ذریعہ نانا کی امت کی اصلاح کرنا ہے۔ یہ وہ مقصد اور پیغام ہے جسے امام نے اپنی زبان عصمت سے بصراحت بیان فرمایا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ آپ کی یاد اور نام پر منعقد کی جانے والی عزاداری اور مجالس غم کا مقصد بھی یہی ہے کہ اچھائیوں کی طرف دعوت دی جائے، برائیوں اور خرافات و بدعات سے روکا جائے اور سیرت محمد و آل محمدؐ کے بیان کے ذریعہ معاشرہ کی اصلاح کی جائے۔

عزائے سید الشہداءؑ کے دوران جب تاریخ کربلا بیان کی جاتی ہے اور اس واقعہ کے اسباب و محرکات، دروس اور عبرتوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے تو ہر زمانہ کا انسان ان کا انطباق اپنے معاشرہ پر کرتا ہے اور غور و

فکر کے بعد سماجی برائیوں اور ان کے ازالہ کی ضرورت کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ امام حسینؑ اور ان کے اصحاب و انصار کے اوصاف و فضائل سن اور پڑھ کر اپنے زمانہ کے سچے حسینیوں کی شناخت حاصل کرتا ہے اور شمر و یزید و ابن زیاد جیسے ملعونوں کے حرکتوں سے آشنائی کے بعد اپنے دور کے شمر و یزید و ابن زیاد کو پہچاننے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر کربلا سے درس لے کر اپنی فرض شناسی کی بنیاد پر حتی المقدور معاشرہ میں اچھائیوں کی ترویج اور برائیوں سے مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ یقیناً یہ مجالس اور عزاداری اصلاح معاشرہ کا بہترین ذریعہ ہیں۔

کہاں تک ذکر کیا جائے کہ عزائے سید الشہداء اور ذکر محمد و آل محمدؐ کے بے پناہ روحانی و مادی فوائد و آثار و نتائج ہیں جن کا بیان ایک مکمل کتاب چاہتا ہے۔

دشمن کی سازشوں سے ہوشیار

واقعہ کربلا کی یاد اور عزائے امام حسینؑ کے انعقاد میں ہر لحاظ سے بہترین اہتمام کرنا چاہئے اور جہاں تک ہو سکے عظیم الشان انداز میں اس کا انعقاد کیا جانا چاہئے۔ ہر شخص حسب استطاعت اس اہتمام میں شریک ہو۔ لیکن اس سلسلہ میں ہوشیار و خبردار رہنے کی ضرورت ہے کہ عزائے امام حسینؑ نامی ہمارے اس عظیم سرمائے پر اسلام دشمن عناصر کی ناپاک نظر ہے۔ وہ بھی اس کی عظمت و اہمیت سے بخوبی واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ عزاداری ہی ہے جس نے مکتب کربلا کو آج تک لوگوں کے ذہن و دل میں تر و تازہ رکھا ہے اور یہی دین اسلام اور مذہب اہلبیتؑ کی بقا کا ایک اہم سبب بھی ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اس قوم سے دولت عزا نہیں چھینی جا سکتی۔ لہٰذا اب ان کا منصوبہ یہ ہے کہ عزاداری اور یاد کربلا کو اس کے اصل مقصد سے منحرف کر دیا جائے، مجالس کی شکل بگاڑ دی جائے، اس مرکز اتحاد کو بھی سبب تفرقہ و اختلاف بنا دیا جائے تاکہ عزاداری کا ظاہر تو باقی رہے لیکن اس کی وہ روح ختم کر دی جائے جس سے اس قوم کو صحیح اسلام اور نعمت ایمان و عمل نیز حریت و آزادی، عدل و انصاف، مخالفت ظلم، حمایت مظلوم اور عالمی استکبار و سامراجیت کے خلاف قیام کا درس ملتا ہے۔

لیکن ہم پیروان مکتب کربلا بھی اصحاب امام حسینؑ سے درس حریت و اتحاد لیتے ہوئے یہ عہد کرتے ہیں کہ دشمن کو اس کے منحوس عزائم اور ناپاک مقاصد میں ہرگز کامیاب نہ ہونے دیں گے۔

لہٰذا عزاداری امام حسینؑ میں شریک تمام افراد، چاہے وہ بانی مجلس ہو یا انجمن کے عہدیداران و ممبران، خطیب ہو یا نوحہ خواں، ماتمی دستہ ہو یا عام عزادار، مرد ہو یا عورت، بوڑھا ہو یا جوان، سب کی ذمہ داری ہے کہ اپنے قول و عمل سے مقاصد امام

حسینؑ کا تحفظ اور اس کی تبلیغ و ترویج کریں اور عزائے سید الشہداء کو ایک عظیم عبادت سمجھ کر انجام دیں اور اسے اللہ سے قربت کا بہترین ذریعہ سمجھیں۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی ذمہ داری مجالس کو خطاب کرنے والے علماء و خطباء پر عائد ہوتی ہے کہ وہ منبر کا صحیح استعمال کریں، اسلام اور شریعت کی پاسداری کریں، اصل سیرت و فضائل معصومینؑ بیان کریں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ اصلاح معاشرہ کی کوشش کریں۔ بانیان مجالس کی بھی ایک عظیم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ صرف نیک، متقی و پرہیزگار، فرض شناس اور قوم کا درد رکھنے والے علماء و خطباء کو مجالس و محافل سے خطاب کے لئے مدعو کریں۔ مقصد عزا کے تحفظ اور دشمن کو اس کے ناپاک عزائم میں شکست سے دوچار کرنے کے لئے ان باتوں پر توجہ دینا بے حد ضروری ہے۔ اسی میں قوم کی کامیابی ہے۔

حضرت فاطمہؑ سے منسوب پانچ افتخار

حضرت پیغمبر اکرمؐ نے جناب فاطمہ زہراؑ سے فرمایا: میری پیاری بیٹی فاطمہؑ! اس امت کے لئے پانچ افتخار ہیں اور وہ سب تجھ سے متعلق ہیں۔

(۱) سب سے بڑا افتخار اس امت کے پیغمبرؐ ہیں اور وہ تمہارا بابا ہے۔

(۲) تمام نبیوں کے اوصاء (جانشینوں) میں سب سے بہترین جانشین علیؑ ہیں جو تمہارے شوہر ہیں۔

(۳) حسنؑ اور حسینؑ یہ دو بہترین پھول، جنت کے جوانوں کے سردار ہیں جو تمہارے بیٹے ہیں۔

(۴) حمزہؓ جو شہیدوں کے سردار ہیں وہ تمہارے بابا کے چچا ہیں۔

(۵) مہدی (عج) تمہاری اولادوں میں سے ہیں جس کے انتظار میں تمام دنیا انتظار رہے گی۔

(بحار الانوار، ج ۲۵، ص ۲۵)

قرآن، امام حسین ؑ اور امام مہدی(عج) میں باہمی ارتباط

❖ تحریر: مولانا سید تعلیم رضا جعفری۔ طالب علم جامعۃ المصطفیٰ(ص) العالمیہ۔ قم

مقدمہ

محرم اور عاشورا کے سلسلے میں بیان بہت زیادہ ہے جتنا بھی عاشورا کی عظیم تحریک کے اسرار و فوائد کو بیان کرتے ہیں پھر بھی اس بیکراں دریا کے سامنے قطرہ کی مانند ہی نظر آتا ہے، ہم تاریخ کے اس عظیم فیصلہ کن حادثہ کی گہرائیوں تک نہیں پہونچ سکتے ہیں، لیکن یہاں قرآن اور حادثہ عاشورا کے درمیان پائے جانے والے گہرے رابطوں کو چند شکلوں میں بیان کر رہے ہیں تاکہ قرآن اور عاشورا کے ایک ساتھ ہونے کا مشاہدہ کر سکتے ہیں:

قرآن اور امام حسینؑ میں ارتباط کے شکلیں:

یہاں قرآن اور امام حسینؑ کے درمیان پائے جانے والے ارتباط کی اہم شکلوں کو بیان کیا جارہا ہے:

پہلی شکل: کربلا میں قدم قدم پر آیات قرآنی کی تلاوت:

امام حسینؑ نے جب مدینہ سے مکہ کی طرف حرکت فرمائی تو اس آیت کی تلاوت فرمائی: «رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظّالِمِينَ» (قصص،۲۱)؛ خداوندا! مجھے اس ظالم قوم کے شر سے نجات عطا فرما۔

اس کے بعد جب مکہ پہونچے ہیں تو امام تلاوت فرماتے ہیں: «وَلَمّا تَوَجَّهَ تِلْقاءَ مَدْيَنَ قالَ عَسى رَبِّي أَنْ يَهْدِيَنِي سَواءَ السَّبِيلِ» (قصص،۲۲) اور جب شہر مدین کی طرف رخ کیا تو موسیٰؑ نے کہا امید ہے کہ میرا پروردگار مجھے سیدھا راستہ بتائے۔

جب شہر مکہ میں لوگوں سے آپؑ نے ملاقات فرمائی تو قرآنی آیات کی روشنی میں لوگوں سے کہا: "اے لوگو! میں تمہیں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی طرف دعوت دیتا ہے"۔ (تاریخ طبری، ج ۳، ص ۲۸)۔

شیخ مفید رح، ضحاک بن عبداللہ نامی شخص سے نقل کرتے ہیں ابن سعد کا ایک سپاہی ہمارے پاس سے گزرا وہ سپاہی ہم لوگوں پر نظر رکھ رہا تھا اور ہمیں گھیرے ہوئے تھا اسی اثنا میں امام حسینؑ، اس آیت کی تلاوت فرماتے رہے تھے: «وَ لا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّما نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِأَنْفُسِهِمْ إِنَّما نُمْلِي لَهُمْ

لِيَزْدادُوا إِثْماً وَ لَهُمْ عَذابٌ مُهِينٌ»(آل عمران،۱۷۸)؛ اور کافر لوگ یہ خیال نہ کریں کہ ہم جو ان کو مہلت دیئے جاتے ہیں تو یہ ان کے حق میں اچھا ہے۔ (نہیں بلکہ) ہم ان کو اس لئے مہلت دیتے ہیں کہ اور گناہ کرلیں۔ آخر کار ان کو ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔

دوسری شکل: شہادت کے بعد تلاوت قرآن:

امام حسینؑ اور آپ کے صحابیوں کی شہادت کے بعد بھی ہم قرآن اور امام حسینؑ کے درمیان ارتباط کا مشاہدہ بخوبی کرسکتے ہیں، چنانچہ متعدد روایات کی روشنی میں آیا ہے کہ: امام حسینؑ کا سر مبارک قرآن کی تلاوت فرمارہا تھا، جناب زید بن ارقم بیان کرتے ہیں کہ میں نے خود سر امامؑ سے سنا کہ وہ اس آیت کی تلاوت فرمارہا تھا: «أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحابَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيمِ كانُوا مِنْ آياتِنا عَجَباً» (کہف۹)؛ کیا تم خیال کرتے ہو کہ اصحاب کہف اور اصحاب لوح والے ہمارے نشانیوں میں سے عجیب تھے۔

اسی طرح ایک یہودی کہتا ہے کہ میں نے امام حسینؑ نے سر مبارک سے اس آیت کی تلاوت سنی: «وَ سَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ» (شعراء،۲۲۷)۔ اور ظالم عنقریب جان لیں گے کہ کون سی جگہ لوٹ کر جاتے ہیں۔

تیسری شکل: قرآن اور زیارت امام حسینؑ:

قرآن مجید کا ایک اہم اصول جس پر قرآن بہت تاکید کرتا ہے وہ نیک و اچھے لوگوں سے عشق و محبت کرنا ہے اور برے اور بدکار لوگوں سے نفرت کرنا ہے۔

اگر ہم امام حسینؑ پر سلام پڑھتے ہیں تو ہمیں قرآن نے سیکھایا ہے چنانچہ متعدد آیات میں بیان ہوا ہے: «سَلامٌ عَلى نُوحٍ فِي الْعالَمِينَ» تمام جہان میں نوحؑ پر سلام (صافات، ۷۹) «سَلامٌ عَلى إِبْراهِيمَ؛ ابراہیمؑ پر سلام ہو (صافات،۱۰۹)۔ «سَلامٌ عَلى مُوسى وَ هارُونَ» موسیٰؑ اور ہارونؑ پر سلام ہو (صافات،۱۲۰)۔ «سَلامٌ عَلى إِلْ ياسِينَ»؛ آل یاسین پر سلام ہو (صافات،۱۳۰)۔

اسی طرح اگر پیغمبرؐ اور آپ کی آل پاک پر صلوات وسلام پڑھتے ہیں تو یہ بھی قرآن ہی نے بتایا: «إِنَّ اللهَ وَ مَلائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوا تَسْلِيماً»؛ (احزاب،۵۶)؛ خدا اور اس کے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں۔ مومنو! تم بھی ان پر دُرود اور سلام بھیجا کرو۔ (واضح رہے کہ کثیر روایات کی بنا پر اس آیت کے ذیل میں اہل بیت پیغمبرؐ بھی شامل ہیں، بلکہ اگر کوئی فقط نبیؐ پر صلوات بھیجنے پر اکتفا کرتا ہے تو اس کی صلوات ادھوری ہے)۔

اسی طرح اگر بنی امیہ اور حکومت حق کے غاصبوں اور تاریخ انسانیت کے تباہکاروں پر لعنت و نفرین

کرتے ہیں تو یہ بھی ہم نے قرآن ہی سے سیکھا ہے: «إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللهَ وَ رَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللهُ فِي الدُّنْيا وَ الْآخِرَةِ وَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذاباً مُهِيناً» (احزاب، ۵۷)۔ جو لوگ خدا اور اس کے پیغمبر کو رنج پہنچاتے ہیں ان پر خدا دنیا اور آخرت میں لعنت کرتا ہے اور ان کے لئے اس نے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

چوتھی شکل: قرآن اور عزاداری:

قرآن مجید میں عزاداری کا خود ذکر آیا ہے خود خداوند عالم نے متعدد آیات میں مومنین پر ہونے والے مظالم و مصائب کا تذکرہ کیا ہے؛ چنانچہ سورہ بروج میں اصحاب اخدود کا تذکرہ یوں فرماتا ہے: «قُتِلَ أَصْحابُ الْأُخْدُودِ . . .»؛ کہ خندقوں (کے کھودنے) والے ہلاک کر دیئے گئے، آگ (کی خندقیں) جس میں ایندھن (جھونک رکھا) تھا، جب کہ وہ ان (کے کناروں) پر بیٹھے ہوئے تھے، اور جو (سختیاں) اہل ایمان پر کر رہے تھے ان کو سامنے دیکھ رہے تھے، ان کو مومنوں کی یہی بات بری لگتی تھی کہ وہ خدا پر ایمان لائے ہوئے تھے جو غالب (اور) قابل ستائش ہے۔ (سورہ بروج، آیت ۴-۸)۔

اس کے علاوہ بہت سی آیات ہیں جن میں مصیبتوں کا ذکر کیا گیا ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصائب اور مشکلات کا بیان کرنا خود پروردگار کی شیوہ ہے اور اس پر عمل کرتے ہوئے عاشورا کے مصائب کو بیان کرنا بھی قرآنی اور الٰہی طریقہ پر عمل کرنا ہے۔

پانچویں شکل: قرآن اور عاشورا کا ہمیشہ باقی رہنا:

رسول اکرمؐ نے کئی بار اور متعدد شکلوں میں بیان فرمایا ہے کہ: میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، ایک کتاب الٰہی اور دوسرے میرے اہلبیتؑ، یہ دونوں چیزیں کبھی جدا نہیں ہونگے (میر حامد حسین، عبقات الانوار، ۱۳۶۶ش، ج۱۸)۔

یہ کلام نبویؐ امام حسینؑ کے ہمیشہ باقی رہنے کے راز کو بیان کرتا ہے، آپ رسول اللہؐ کے بیٹے ہیں اور ان کی پاکیزہ عترت میں سے ہیں جن کی جان و روح قیمتی حقائق سے بھری ہوئی ہے اور قرآن خداوند عالم کی ہمیشہ رہنے والی کتاب ہے تو امام حسینؑ بھی کتاب خدا کی بولتے ہوئے مفسر ہیں اور دونوں ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں۔ (بحار الانوار، ج۲۵، ص۲۱۵)۔

چھٹی شکل: قرآن اور عاشورا سے رابطہ و رشتہ:

ایک اہم ترین بحث اس سلسلے میں یہ بیان کی جاتی ہے کہ قرآن مجید اور عاشورا کی عظیم درس گاہ سے ہم کیسے ارتباط برقرار کریں اور کیسا رابطہ ہماری زندگی کو زیادہ موثر بنا سکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں ہم یہاں دیگر روابط و شکلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے تین طرح کے اہم

رابطوں اور شکلوں کو بیان کرتے ہیں جن پر ہمیں پوری پابندی کرنے کی کوشش کرنا چاہئے:

۱: قرآن و حسینی درسگاہ سے علمی ارتباط:

قرآن اور امام حسینؑ دونوں ہی ہمیں علم کے عظیم دریا میں داخل کردینے کے لئے کافی ہے۔ قرآن کے کلمات کو پہچاننا، قرآنی آیات کی تفسیر، مختلف بیانات و ادبیات کی شناخت سے ہم بے شمار بحثوں اور علوم کے دریچوں تک پہونچ سکتے ہیں۔ اسی طرح امام حسینؑ اور عاشورا کے ذریعہ بھی ہم ادبیات، تاریخ، معارف اسلامی، ظلم و ستم کے خلاف انقلاب، صالح و بہترین معاشرے کو وجود میں لانے والے عوامل و ذرائع کی شناخت حاصل کرکے دنیا کو معنوی و روحانی اعتبار سے گلستان بنا سکتے ہیں۔

۲: حصول برکت:

قرآن اور امام حسینؑ دونوں ہی سے برکت حاصل کرنے والا رابطہ آج کے زمانے میں بہت رائج ہے، برکت و تبرک کے مسئلہ کو خود قرآن مجید نے متعدد نمونے پیش فرمائے ہیں جیسا کہ آیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی آنکھوں کی روشنی جانے کے بعد حضرت یوسفؑ کے پیراہن کی برکت سے دوبارہ روشنی حاصل ہوئی ہے (یوسف، ۹۳)۔ اسی طرح خود قرآن مجید سے تبرک حاصل کرنے کی آج کے زمانے میں رائج صورتوں میں قرآن کا بوسہ لینا، سفر کے آغاز میں قرآن کے نیچے سے گزرنا، قرآن کو ساتھ میں رکھنا، قرآن کے ذریعہ بیماروں کے لئے شفاطلب کرنا، قرآن سے استخارہ کرنا وغیرہ مسلمانوں کی اکثریت کے نزدیک مسلم و متفقہ عمل ہے۔ حضرت امام حسینؑ کی شخصیت اور عاشوراء سے مربوط امور جیسے غم حسینؑ میں ماتم کرنا، توسل کرنا، تربت حسینؑ کا ساتھ میں رکھنا، سجدہ کرنا، میت کے ساتھ میں رکھنا، بچے کی ولادت پر خاک شفا کو چکھانا، ضریح، علم مبارک کو چومنا، مجلسوں میں شرکت وغیرہ یہ سب مکتب امام حسینؑ سے تبرک حاصل کرنے کی شکلیں ہیں اور ان میں سے بہت سے طریقے عام مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں کے نزدیک بھی مورد پسند ہیں۔ اور شیعوں کے درمیان تو یہ رابطہ بہت ہی عمیق رہا ہے۔ شیعہ ہمیشہ سے حصول تبرک کے لئے امام حسینؑ اور آپ سے منسوب امور سے مرتبط رہے ہیں اور ظاہری و باطنی لحاظ سے برکت حاصل کرتے رہے ہیں۔

اس مقام پر ہم سب کو بہت سوچنا اور سمجھنا ہوگا کہ جب قرآن اور امام حسینؑ سے مربوط ظاہری چیزیں ہمارے تبرک و برکت کے لئے بہت زیادہ مہم و قابل احترام ہیں اور ہم ہمیشہ اس طرح سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں اور اپنی دلی مرادوں کو پاتے ہیں، تو کیوں نہ قرآن اور تعلیمات امام حسینؑ پر عمل کرکے اپنے لئے

دنیا و آخرت میں روحانی سکون اور حقیقی برکت حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔

۳: قرآن و عاشورا سے عملی ارتباط:

قرآن اور امام حسینؑ کی زندگی، خاص طور پر تحریک عاشوراء ہمارے لئے میدان عمل میں بہت موثر ہے، دونوں ہی ہمیں باعمل بنانے کے لئے ہے؛ جیسا کہ خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے: «**فَمَنْ كانَ يَرْجُوا لِقاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صالِحاً وَ لا يُشْرِكْ بِعِبادَةِ رَبِّهِ أَحَداً**» (کہف، ۱۱۰)؛ جو شخص اپنے پروردگار سے ملنے کی امید رکھے چاہیئے کہ عمل نیک کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔

یعنی قرآن و امام حسینؑ سے علمی اور برکت والا رابطہ تنہا کافی نہیں ہے بلکہ دونوں ہی کی پناہ میں رہنا اور ان کے سایے میں زندگی گزارنا ضروری ہے۔ حدیثوں کے مطابق جب فتنوں، مختلف قسم کے چیلنجوں اور خطروں کا سامنا ہو اور تاریک شبوں کی مانند گمراہیوں اور باطل کا سایہ زندگی کو گھیر لے تو قرآن و اہل بیتؑ کی پناہ میں رہنا چاہیئے۔ یعنی قرآن پر عمل کیا جائے اس لئے کہ قرآن پر عمل ہم کو اندھیروں سے نور کی طرف کھینچتا ہے اور مشکلات سے باہر نکالتا ہے، قرآنی مفاہیم کو چھوڑ کر ظاہری رابطہ ہمیں کہیں بھی نہیں پہونچا سکتا ہے بلکہ ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے اجتماعی، سیاسی، فرہنگی اور اقتصادی میدانوں اور مشکلات کے حل کے لئے قرآن کو اپنے عمل اور کاموں میں ساتھ رکھیں اور قرآن سے نجات کی راہ حاصل کریں۔

امام حسینؑ اور عاشورا سے رابطے میں بھی اگر ہم امام حسینؑ کو اپنا قائد، سردار و پیشوا کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو کیونکہ آپ عمل کا ایک مجسمہ ہیں، عملی زندگی کے لئے ایک رول ماڈل و کامل آئیڈیل ہیں، آپ نے زندگی کی تمام اقدار کو عملی طور پر میدان میں پیش کیا ہے لہٰذا ہمیں بھی امام حسینؑ کی طرح ظالموں کے مقابلے کھڑے رہنا ہوگا اور ہر قسم کی ذلت سے دور رہنا ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ اگر امام حسینؑ ہمارے عمل و کردار کے مقتدا و امام ہوں تو ہم تمام میدانوں کی مشکلات میں کامیاب و کامران ہو سکتے ہیں لیکن نہایت افسوس ہے آج ہم نے اپنی عزاداریوں، مجلسوں، جلوسوں، تعزیہ داریوں اور علم مبارک ... اور اسی طرح قرآن مجید کو بھی صرف ظاہری طور پر تبرک اور برکت حاصل کرنے کی حد میں محدود کر رکھا ہے اور عملی لحاظ سے ہمارا رابطہ بہت سست اور کمزور ہوتا جا رہا ہے جسے مضبوط کرنے کی نہایت ضرورت ہے۔

امام حسینؑ اور امام مہدی(عج) میں ارتباط کی شکلیں:

تحریر کے اس حصے میں حضرت امام حسینؑ اور حضرت امام مہدی(عج) کی بعض اہم شباہتوں اور رابطوں کی شکلوں کا ذکر کیا جا رہا ہے:

۱۔ پہلی شکل: امام حسینؑ اور امام زمانہ(عج) دونوں "ثاراللہ" ہیں:

عربی زبان میں "ثار" "خون" اورانتقام و خونخواہی کے معنی میں آیا ہے۔(الطریحی، مجمع البحرین، ج ا، ص ۲۳۷، فرہنگ محمد معین، ج ا، ص ۱۱۸۵، مفردات راغب اصفہانی، ص۸۱)۔

اور"ثار اللہ" کے لئے کے لئے مختلف معانی ذکر کئے گئے ہیں اور ہر ایک اپنی جگہ پر تفسیر طلب ہے۔ مجموعی طور پر روایات کی روشنی میں امیر المؤمنینؑ اور امام حسینؑ کو "ثار اللہ" کہا گیا ہے اور زیارات میں ہم پڑھتے ہیں: «السَّلامُ عَلَیکَ یا ثارَ الله وَابنَ ثارِهِ وَ الوِترَ المَوتُورَ» (مفاتیح الجنان)؛ان کے خون کا ولی و وارث خود خدا ہے اور خدا خود ہی ان کے خون کا بدلہ ان کے قاتلوں سے لے گا۔ کیونکہ ان دو بزرگوں کا خون بہا کر دشمنان دین اس مقدمے میں خدا کے سامنے مدعا علیہ کے طور پر فریق بنے ہوئے ہیں اور یہ دشمنان دین حقیقت میں حریم الہی کے خلاف جارحیت و تجاوز کے مرتکب ہوئے ہیں۔ جیسا کہ حضرت امام صادقؑ سے منقول ایک زیارت کے جملات میں آیا ہے کہ:

«انک ثارالله فی الارض من الدم الذی لا یدرک ثاره احد من (اهل) الارض (الا باولیائک)، و لا یدرکه الا الله وحده»؛ (بحار الانوار، ج۱۰۱، ص۱۶۸)؛اے حسینؑ! آپ زمین پر خون خدا ہیں۔ وہی خون جس کا انتقام (ان کے وارثوں کے علاوہ) کوئی نہیں لے پائے گا۔اور خدا کے علاوہ اس کا انتقام کوئی نہیں لے گا۔

خون امام حسینؑ کے انتقام کا مسئلہ متعدد روایات کی روشنی میں امام زمانہ (عج) سے مربوط بھی بیان کیا گیا ہے کہ خداوند عالم کی جانب سے آپ ظہور کے بعد ایک اہم کا انتقام خون حسینؑ کا کریں گے۔قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

«أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَ إِنَّ اللهَ عَلى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ»؛"جن لوگوں پر ظلم کیا گیا ہے انہیں جنگ و دفاع کی اجازت ہے اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے" (حج، ۳۹)۔ اس آیت کو متعدد روایات میں حضرت امام مہدی(عج) سے مربوط بیان کیا گیا ہے جیسا کہ امام صادقؑ فرماتے ہیں: «...إِنَّمَا هُوَ الْقَائِمُ(عج) إِذَا خَرَجَ يَطْلُبُ بِدَمِ الْحُسَيْنِ وَ هُوَ قَوْلُهُ نَحْنُ أَوْلِيَاءُ الدَّمِ وَ طُلَّابُ التِّرَةِ (الدِّيَةِ)»؛ اس آیت سے مراد قائم آل محمدؐ ہے جو ہمارے مظلوم جد امام حسینؑ کے خون کے انتقام کے لئے قیام کریں گے" (بحار الانوار، ج۲۴، ص۲۲۷؛ ج۵۱، ص۴۷)۔

مذکورہ روایات کی روشنی میں جہاں امام حسینؑ کو "ثار اللہ" خون خدا بیان کیا گیا ہے اسی طرح امام مہدی(عج) کو "منتقم خون خدا" بیان کیا گیا ہے لہٰذا دونوں حضرات میں گہرا رابطہ پایا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں مزید مطالب کو آئندہ بیان کیا جائے گا۔

۲۔ دوسری شکل: امام حسینؑ اور امام زمانہ(عج) دونوں "طرید"، "شرید" اور "وترالموتور" ہیں۔

"طرید" کے معنی گھر و کاشانہ چھوڑنے پر مجبور کیا جانے والا اور بر کنار کیا جانے والا۔

"شرید" طرید کی مانند ہے اور اس کے معنی بے وطن ہونے والا اور وطن کو چھوڑنے پر مجبور کیا جانے والا۔

"وتر الموتور" کے چند معنی ہیں:

۱۔ وہ فرد جو خود بھی جرم کا نشانہ بنے اور اس کے اہل خاندان پر بھی ظلم کیا جائے۔

۲۔ وہ انسان جس کو اس کے اہل خاندان کے ساتھ قتل کیا گیا ہو۔

۳۔ وہ اکیلا فرد جس کے خاندان کے افراد کو قتل کیا گیا ہو۔

۴۔ وہ تنہا انسان جس کو اہل خاندان کے ہمراہ قتل کیا گیا ہو اور اس کا انتقام نہ لیا گیا ہو۔

۵۔ یگانۂ دوران یعنی وہ جو انسانی کمالات میں بے مثل و منفرد ہو۔

(کتاب "بر رسی و تحلیلی پیرامون زیارت عاشورا"، ص ۸۲۔ کتاب "مدرسہ عشق" ص ۱۳۷)۔

امام مہدی(عج) بھی ولادت کے بعد سے غیبت صغریٰ اور اس کے بعد غیبت کبریٰ سے لے کر آج تک چونکہ اپنے گھر و وطن سے دور ہیں اور بے جرم وخطا ہمیشہ دشمنوں کے نرغہ میں گرفتار ہیں لہٰذا آپ بھی امام حسینؑ سے شباہت رکھتے ہیں۔

۳۔ تیسری شکل: دونوں اماموں کے اہداف مشترکہ ہیں:

حضرت امام حسینؑ کے قیام کا مقصد اور ہدف جیسا کہ دسیوں اقوال کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ حق و صداقت اور دینی و انسانی اقدار کی زندگی اور معاشرہ اسلامی اور معاشرہ انسانی کی اصلاح کرنا تھا اور ظلم و ستم کی نابودی اور عدل و انصاف کی حکمرانی قائم کرنا ہے۔ جیسا کہ زیارت اربعین میں بھی بیان ہوا ہے کہ:

"امام حسینؑ اپنا خون تیری (یعنی اللہ کی) راہ میں قربان کیا تاکہ انسانون کو نادانی اور گمراہی سے نجات دلائیں"۔ (مجلسی، بحار الانوار، ج ۵۲، ص ۳۰۸ و ۳۸۶)۔

امام زمانہ(عج) کی ذات بھی اس لحاظ سے امام حسینؑ کی طرح ہیں جیسا کہ امام باقرؑ نے فرمایا: "جب ہمارا قائم قیام کرے تو وہ باطل کو حتمی طور پر نیست و نابود کریں گے"۔ (کلینی، اصول کافی، ج ۸، ص ۲۷۸)۔

دونوں شخصیتوں کی عصری صورت حال ایک جیسی ہے اور دونوں کا زمانہ فساد اور گناہ و بے دینی اور بدعتوں کی عالمی ترویج کے لحاظ سے ایک جیسا ہے اور دونوں کے اصحاب خاص ایک جیسی معرفت و محبت و اطاعت کے مدارج پر فائز ہیں (بحار الانوار، ج۴۵، ص۶)۔

۴۔ چوتھی شکل: عاشورا اور انتظار میں رابطہ:

عاشورائی تعلیم و تہذیب تہذیبِ انتظار کا سرچشمہ ہے۔ انتظار، عاشورا کا تسلسل ہے؛ زیارت عاشورا کے دو حصوں میں حضرت مہدی (عج) کے رکاب میں امام حسینؑ کی خونخواہی اور انتقام کی خبر دی جارہی ہے۔ چنانچہ انتظار در حقیقت، انتقام عاشورا کا انتظار ہے اور حضرت مہدی (عج) کے اصحاب سب عاشورائی ہیں۔ صرف وہ لوگ امام مہدی (عج) کے رکاب میں لڑ کر امام حق کی مدد کرسکتے ہیں جو مکتب عاشورا میں صیقل ہوئے ہوں اور حق و باطل کے معیار کو صحیح طریقے سے پہچان چکے ہوں اور بصیرت کی چوٹیوں تک پہنچے ہوں کیونکہ حسینؑ خود حق و باطل کا معیار و میزان ہیں اور تولّی اور تبرا اور سلم و حرب کا پیمانہ ہیں۔

۵۔ پانچویں شکل: قیام مہدی (عج) و قیام حسینؑ کے اہداف میں مماثلت:

امام حسینؑ قرآن اور سنت نبوی کے احکام اور سنتوں کے احیاء اور بنوامیہ کی حاکمیت کی وجہ سے پھیلنے والی بدعتوں اور دین میں رائج ہونے والی تحریفات کے خاتمے کے لئے اٹھے اور مکہ معظّمہ سے کربلائے معلیٰ کی طرف سفر کے دوران راستے میں اپنے قیام کے محرکات بیان کرتے ہوئے فرمایا: میں اپنے نانا رسول اللہؐ کی امت میں اصلاح کے لئے اٹھا ہوں؛ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہتا ہوں اور اپنے نانا رسولؐ اور اپنے والد امیر المؤمنین علیؑ بن ابی طالبؑ کی سیرت پر کاربند رہنا اور عمل کرنا چاہتا ہوں (بحار الانوار، ج۵۱، ص۱۳۰)۔

امام حسینؑ کے کلام کے مجموعے سے تحریک عاشورا کے اعلی و اہداف و اغراض کا بخوبی اظہار ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ قرآن، سنت رسولؐ اور سیرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالبؑ کے احیاء اور انحرافات اور گمراہیوں اور بدعتوں کے خاتمے، حق کو حاکم بنانے اور حق پرستوں کو حاکمیت بخشنے، ستمگروں کی حکومت کی استبدادیت و آمریت کو نابود کرنے اور سماجی و معاشی شعبوں میں عدل و قسط کے فروغ کے لئے کربلا تشریف فرما ہوئے تھے اور یہی قیام عاشورا کے اہداف و مقاصد تھے۔

دوسری طرف سے جب ہم عالم بشریت کے نجات دہندہ حضرت امام مہدی (عج) کے قیام اور آپ (عج) کی عالمی حکومت کے مطمع نظر کا جائزہ لیتے

ہیں وہاں بھی یہی اہداف و مقاصد نظر آتے ہیں اور حتی کہ عبارات اور الفاظ بھی ایک جیسے ہیں۔

امیر المؤمنین علی بن ابی طالبؑ، حضرت مہدی(عج) کی حکومتی روش کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: جب دوسرے ہوائے نفس اور نفسانی خواہشات کو ہدایت پر مقدم رکھیں اور ترجیح دیں، امام مہدی(عج) نفسانی امیال و خواہشات کو ہدایت کی طرف لوٹاتے ہیں اور ایسے حالات میں-جب دوسرے اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کرتے ہیں - امام مہدی(عج) آراء و عقائد کو قرآن کی طرف لوٹائیں گے۔ وہ لوگوں کو بتا دیں گے کہ کس طرح نیک سیرت اور روش کے ساتھ عدل و قسط کے مطابق عمل کیا جاسکتا ہے اور وہ قرآن سیرت نبوی کو زندہ کریں گے (الزام الناصب، ص۱۷۷)۔

امام باقرؑ فرماتے ہیں: قائم آل محمد (ص) لوگوں کو کتاب اللہ اور سنت رسولؐ اور ولایت علی بن ابی طالبؑ اور ان کے دشمنوں سے بیزاری و برائت کی طرف دعوت دیں گے۔ (ینابیع المودۃ، ج۳، ص۶۲)۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

"حضرت مہدی(عج) عالمی سطح پر دین میں رائج ہونے والی بدعتوں کا خاتمہ کریں گے اور ان کے بدلے رسولؐ کی تمام سنتوں کو یکے بعد دیگرے رائج و نافذ کریں گے"۔ (دلائل الامامۃ، ص۲۳۹)۔

۶۔ چھٹی شکل: حضرت مہدی(عج)؛ امام حسینؑ کے خون کے منتقم:

امام حسینؑ اور امام مہدی (عج) میں ایک رشتہ اور رابطہ خون کے انتقام کا بھی پایا جاتا ہے جیسا کہ گذشتہ مطالب میں اشارہ کیا گیا ہے۔

امام مہدی(عج) کے القاب میں سے ایک لقب خود "منتقم" ہونا ہے۔ امام (عج) کے لئے اس لقب کے انتخاب کے لئے اہل بیتؑ کی روایات میں متعدد اسباب بیان ہوئے ہیں۔ امام محمد باقرؑ سے پوچھا گیا کہ اللہ کے آخری ولی اور حجت کو قائم کیوں کہا جاتا ہے؟ امامؑ نے فرمایا:

«لَمَّا قُتِلَ جَدِّی الْحُسَینُ صَلَّی اللَّهُ عَلَیهِ ضَجَّتِ الْمَلَائِکَهُ إِلَی اللهِ عَزَّ وَ جَلَّ بِالْبُکَاءِ وَ النَّحِیبِ وَ قَالُوا: إِلَهَنَا وَ سَیدَنَا أَتَغْفُلُ عَمَّنْ قَتَلَ صَفْوَتَکَ وَ ابْنَ صَفْوَتِکَ وَ خِیرَتَکَ مِنْ خَلْقِکَ؟ فَأَوْحَی اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ إِلَیهِمْ: قَرُّوا مَلَائِکَتِی فَوَ عِزَّتِی وَ جَلَالِی لَأَنْتَقِمَنَّ مِنْهُمْ وَ لَوْ بَعْدَ حِینٍ، ثُمَّ کَشَفَ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ عَنِ الْأَئِمَّهِ مِنْ وُلْدِ الْحُسَینِ عَلَیهِمُ السَّلَامُ لِلْمَلَائِکَهِ فَسَرَّتِ الْمَلَائِکَهُ بِذَلِکَ فَإِذَا أَحَدُهُمْ قَائِمٌ یصَلِّی، فَقَالَ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ: بِذَلِکَ الْقَائِمِ أَنْتَقِمُ مِنْهُمْ»

"جب دشمنوں نے میرے جد امجد امام حسینؑ کو شہید کیا تو فرشتے مغموم ہوئے اور روتے اور آہ و نالہ کرتے ہوئے بارگاہ الہی میں عرض کیا: خداوندا! پروردگارا! کیا تو ان لوگوں سے درگذر کرے گا

جنہوں نے تیرے برگزیدہ بندے اور تیرے برگزیدہ بندے کے فرزند کو بزدلانہ طریقے سے قتل کیا؟ تو خداوند متعال نے فرشوں کے جواب میں ارشاد فرمایا: اے میرے فرشتو! میری عزت و جلال کی قسم! میں ان کا انتقام لونگا چاہے اس میں کافی طویل عرصہ لگ جائے۔ اس کے بعد خداوند متعال نے امام حسینؑ کے فرزندوں کا سایہ دکھادیا اور پھر ان میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا جو حالت قیام میں تھے اور فرمایا: میں اس قائم کے ذریعے امام حسینؑ کے دشمنوں سے انتقام لونگا"۔ (بحار الانوار، ج۴۵، ص۲۲۱)۔

آیت کریمہ «وَمَنْ قُتِلَ مظلوماً فقد جَعَلْنا لِوَلیّه سلطاناً...»؛ اور جو مظلومیت کے ساتھ قتل ہو، ہم نے اس کے وارث کو تسلط عطا کیا ہے۔ کی تفسیر میں امام صادقؑ نے فرمایا: "اس آیت میں مظلوم سے مراد امام حسینؑ ہیں جو مظلومیت کے ساتھ قتل کئے گئے اور «جَعَلنا لِوَلیّه سلطاناً» سے مراد حضرت امام مہدی(عج) ہیں۔ (البرہان فی تفسیر القرآن، ج۴، ص۵۵۹)۔

خلاصہ یہ کہ اہداف کے مشترک ہونے کے علاوہ، امام مہدی(عج) کے قیام کے بعد عالمی حکومت کے قیام کے زمانے میں وہ تمام تر اہداف و مقاصد جامہ عمل پہنیں گے جو امام حسینؑ نے کربلا میں بیان کئے تھے اور تحریک عاشورا بارآور ہوجائے گی اور تحریک حسینی اور ظہور مہدی(عج) کی برکت سے پوری دنیا میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہوگا۔ اور آدمؑ سے لے کر رسول اکرمؐ تک، تمام انبیاءؑ کے اہداف حاصل ہوجائیں گے اور آدم کے فرزند صلح و امن و سلامتی اور سعادت کا مزہ چکھیں گے۔

زیارت حسینی ؑ سے فرار کا نتیجہ

حضرت امام صادقؑ فرماتے ہیں:

«جو شخص امام حسینؑ کی زیارت کے لئے نہ جائے یہاں تک کہ مرجائے تو ایسا شخص دین و ایمان کے لحاظ سے ناقص ہے اور اگر جنت میں داخل ہوجائے تو اس کا درجہ تمام اہل ایمان سے کم ہے»۔

(کامل الزیارات، ص۱۹۳، باب۷۸، حدیث۲)۔

شب عاشور کی مہلت اور حکمتیں

• تحریر: حجۃ الاسلام مولانا سید محمد مجتبیٰ علی رضوی، دہلی، ہند

تمہید

معرکۂ کربلا اور انقلاب حسینیؑ کی تاریخ محتاج تعارف نہیں ہے تاریخ اسلام سے مختصر آشنائی رکھنے والے بھی کربلا کو جانتے ہیں۔ اور اس کی اہمیت اور عظمت کے قائل ہیں۔ تاریخ کربلا کوئی گونگی تاریخ نہیں ہے بلکہ بولتی ہوئی تاریخ ہے اور اس کے تمام پہلوؤں کو خود امام حسینؑ نے بارہا اپنے واضح بیانات کے ذریعہ روشن کیا ہے۔ یہ ایک ایسا عظیم اور معرکۃ الاراء انقلاب ہے کہ جس کے تمام تر جزئیات بھی کتابوں میں موجود ہیں۔ جس سے بخوبی واقعۂ کربلا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ جیسا کہ خود انقلاب کے پہلے ہی دن امام حسینؑ نے اپنے قیام کا مقصد واضح کر دیا کہ یہ کس طرح کا انقلاب ہے اور کیوں ہے؟

آغاز انقلاب کربلا

جس وقت حاکم شام معاویہ بن ابو سفیان اس دنیا سے گیا تو یزید ملعون اسلامی حکومت کا حاکم ہوا یہ دنیائے اسلام کے لئے ایک بہت بڑا المیہ تھا لیکن اس سے بڑا ستم یہ کہ امت کی اکثریت کے کانوں میں جوئیں تک نہ رینگی اور عوام الناس نے بلا تکلف اس فاسق و فاجر کی بیعت کر لی۔ وہ پہلے سے ہی دین سے بے پرواہ اور بدمست تھا حکومت ملنے کے بعد وہ اور جری ہو گیا اور جسارت یہاں تک ہو گئی کہ فرزند نبی سے مطالبہ بیعت کر بیٹھا۔ چنانچہ اس نے والئ مدینہ کو اس مضمون کا خط لکھا: «**فخذ حسينا و عبدالله بن عمر و عبدالله بن الزبير بالبيعة أخذا شديدا ليست فيه رخصة حتى يبايعوا، و السلام**». حسینؑ، عبد اللہ ابن عمر اور عبد اللہ ابن زبیر سے بیعت لو اور جب تک بیعت نہ کریں کسی قسم کی مہلت و فرصت نہ دینا و السلام۔ (صحیفۂ شہادت، ص ۲۸)۔

یہ لہجہ بتا رہا ہے کہ ارادے کیا ہیں اور بیعت کا مطلب کیا ہے یزید جیسے کی بیعت کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا فاتحہ پڑھنا؛ جیسا کہ خود امامؑ فرماتے ہیں: «وَعَلَى الْإِسْلَامِ السَّلَامُ إِذْ قَدْ بُلِيَتِ الْأُمَّةُ بِرَاعٍ مِثْلَ يَزِيدَ»؛ ایسے اسلام کا فاتحہ پڑھ دینا چاہیئے جس کا یزید جیسا حاکم ہو (صحیفۂ شہادت، ص ۳۲)۔

کیونکہ یزید کا فسق و فجور عیاں تھا وہ کھلے عام محرمات کو انجام دے رہا تھا اسلام کی ہر ممنوعہ چیز اس کو پسند تھی اور وہ اسے کھلے عام انجام دیتا تھا قوانین

اسلام کی اپنے باپ کے زمانے میں ہی پرواہ نہیں کرتا تھا اب تو آزاد تھا حکومت اسلامی اس کے ہاتھ میں تھی۔

جب حاکم مدینہ نے امام حسینؑ کو دربار میں بلوایا اور یزید کا خط سامنے رکھا اور بیعت کی بات کی تو آپ نے صاف صاف فرق واضح کرتے ہوئے بتادیا کہ یزید بیعت کے قابل ہی نہیں ہے؛ چنانچہ امام فرماتے ہیں: «**انا اهل بيت النبوة و معدن الرسالة و مختلف الملائكة و مهبط الرحمة بنا فتح الله و بنا ختم**»؛ ہم اہل بیت نبور ہیں ہم مرکز رسالت ہیں ہمارے یہاں ملائکہ کے آنے کا سلسلہ رہا اور رحمتوں کا نزول ہوا خداوند عالم نے ہم سے ہی شروعات کی اور انتہا بھی ہم ہی سے ہوگی۔ (صحیفہ شہادت، ص ۲۷)۔

اس کے بعد یزید کے کردار کو بیان فرماتے ہیں: «**يزيد رجل شارب الخمر، قاتل نفس المحترمة، معلن بالفسق**»؛ یزید ایک مرد شراب خوار ہے بے گناہوں کا قاتل ہے اور کھلے عام گناہ کرتا ہے (صحیفۂ شہادت، ص ۲۷)۔ لہٰذا «**مثلی لا يبايع مثله**»؛ مجھ جیسا اس جیسے کی بیعت نہیں کر سکتا۔ امامؑ نے واضح الفاظ میں یہ بیان فرمادیا کہ ہم کون ہیں اور یزید کون ہے تو بیعت کا تو سوال ہی نہیں ہوتا۔

امام نے یہاں بھی اخلاق اور آداب کا اتنا لحاظ رکھا کہ جب اپنی تعریف کی تو پورے خاندان کا ذکر کیا لیکن جب یزید کی برائی اور حقیقت بیان کی تو صرف اسی کی بات کہی پورے خاندان کو نہیں گھسیٹا۔ بلکہ صرف اسے برا کہا۔ ہاں اس سے کوئی یہ مطلب نہ نکالے کہ امام نے نبی امیہ کو کلین چٹ دے دی، بلکہ امام نے اپنی اعلی ظرفی کا ثبوت دیا۔ کہ ہم دشمنی میں بھی بد اخلاقی کا مظاہرہ نہیں کرتے ہیں اور نہ ادب کی حدود کو پار کرتے ہیں۔ لہٰذا صرف مد مقابل کا تذکرہ کیا «**يزيد رجل فاسق شارب الخمر**» یزید شراب خوار ہے۔

امام حسینؑ کے اب تک کے بیان سے یہ معلوم ہو گیا کہ کسی بھی زاویہ سے بیعت کا کوئی امکان نہیں تھا بلکہ اب تو اسلام کو بچانا اور سوئی ہوئی اور پژمردہ ہو چکی امت کو جگانا تھا انہیں یہ احساس دلانا تھا کہ تم بے حس اور بے شعور ہو چکے ہو تمہیں حلال و حرام کی تمیز نہیں رہی، تمہیں حق و باطل کو سمجھنے کا شعور ہی نہیں لہٰذا انہیں بیدار کرنا ضروری تھی ایسا کوئی بڑا قدم اٹھانا ضروری تھا جس سے قوم بیدار ہو لہٰذا اپنے بھائی محمد حنفیّہ کے جواب میں امام نے یوں خط لکھا اور اپنے پورے قیام کی وجہ بتائی:

«**و انی لم اخرج اشرا و لا بطرا و لا مفسدا و لا ظالما و انما خرجت لطلب الاصلاح في امة جدي (ص) اريد ان امر بالمعروف و انهي عن المنكر و اسير بسيرة جدي و ابي علي ابن ابي طالب (ع) فمن قبلني بقبول الحق فالله اولى بالحق**

و من رد علي هذا اصبر حتى يقضي الله بيني و بين القوم بالحق و هو خير الحاكمين»؛ (بحار الانوار، ج ۴۴ و ص ۳۲۹؛ مقتل خوارزمی، ج ۱، ص ۱۸۸)؛ نہ میں خود خواہی کے لئے وطن چھوڑ رہا ہوں اور نہ ہی خوش آیند مستقبل کی جستجو میں نہ شر و فساد کے لئے بلکہ اس سفر سے میرا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو اچھائی کی طرف دعوت دوں اور برائی سے روکوں، چاہتا ہوں کہ اپنے جد بزرگوار اور اپنے والد ماجد کے اسوہ حسنہ کو زندہ کروں۔ جس کسی نے اس حقیقت کو قبول کرتے ہوئے میری پیروی کی اس نے راہ حق کو اختیار کیا اور جس کسی نے مجھ سے انحراف کیا تو میں صبر و شکیبائی سے اپنی راہ کی طرف بڑھتا رہوں گا یہاں تک کہ خدا ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان فیصلہ فرمائے کیونکہ وہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

یہ امام کا راستہ تھا امت کا حال اور اپنی ذمہ داریوں کو بتایا کہ سنت نبوی اور سیرت مرتضوی نظر انداز ہو چکی ہے جسے دوبارہ سے زندہ کرنا چاہتے ہیں. برائیاں عام ہیں اچھائیاں نایاب ہو چکی ہیں انہیں دوبارہ سے اپنی جگہ لانا ہے اپنے اس مشن کا پورا حال بتا دیا تو اب سے سے اہم دین ہے۔

شب کی مہلت

اسی طرح امام نے قیام مکہ کے دوران کوفہ والوں کی طرف سے مسلسل اصرار اور خطوط کی آمد کی وجہ سے اپنے بھائی مسلم بن عقیل کو حالات کا جائزہ لینے کے لئے کوفہ بھیجا اور شہر مکہ میں دشمنوں کی آہٹ محسوس کرتے ہوئے اس مقدس شہر کی حرمت کے تحفظ کی خاطر حج کو ترک کیا اور مکہ سے کوچ فرمایا یہاں تک کہ راستہ میں جناب حر کے لشکر سے ملاقات ہوئی اور امام دوسری محرم کو کربلا پہنچ گئے۔

کربلا میں ورود کے بعد عمر بن سعد سے مسلسل گفتگو کا سلسلہ جاری رہا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اس لئے کہ عمر سعد چاہتا تھا کہ امام بیعت کرلیں اور جنگ ٹل جائے امام کسی بھی صورت بیعت کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ امام سب کو بیدار کرنا چاہتے تھے تاکہ امت مسلمہ بیعت فاسق کا طوق اتار پھینکیں لیکن جب دنیا اور اس کا حصول عقلوں پر حاوی ہو جاتا ہے تو امام کی باتیں بھی اثر انداز نہیں ہوتی ہیں۔

آخری خط

جب ابن زیاد کو یہ خبریں ملی کہ عمر سعد جنگ کو ٹال رہا ہے اور امام حسینؑ بیعت کے لئے کسی بھی طرح آمادہ نہیں ہیں تو اس نے ایک آخری خط لکھا جو کربلا میں نو محرم عصر کے وقت عمر سعد کے پاس پہنچا جس کا مضمون تھا کہ یہ خط ملتے ہی یا تو امام حسینؑ سے بیعت لے یا پھر جنگ شروع کردے۔ خط ملتے ہی

پوری یزیدی فوج حرکت میں آ گئی اور چاروں طرف سے خیام امام حسینؑ کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ ادھر جب امام کو یہ اطلاع ہوئی تو آپ نے حضرت عباسؑ کو اپنے پاس طلب فرما کر فرمایا:

«یا عباس، ارکب- بنفسي أنت یا أخي، حتي تلقاهم و تقول لهم: مالکم و ما بدالکم؟ و تسألهم عما جاء بهم»؛

"اے بھائی آپ خود جائیں اور دشمنوں سے دریافت کریں کہ وہ کیا چاہتے ہیں" (تاریخ طبری، ج۷، ص۳۱۶؛ الارشاد شیخ مفید، ج۲ و ص۹۰)۔ جب حضرت عباسؑ لشکر کے پاس پہنچے اور دریافت کیا کہ کیا چاہتے ہو تو یزیدی لشکر نے جواب دیا: ابن زیاد کا خط آیا ہے کہ یا تو ابھی بیعت کریں یا جنگ کے لئے تیار ہو جائیں (صحیفۂ شہادت، ص ۱۴۴)۔

حضرت عباسؑ نے ان سب کو روکا اور امام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دشمنوں کے مقصد سے آگاہ کیا۔ امام نے فرمایا:

«اِرْجِعْ اِلَیهِمْ فَاِنْ اسْتَطَعْتَ اَنْ تُؤَخِّرَهُمْ اِلی غَدْوَةٍ وَتَدْفَعَهُمْ عَنّا الْعَشِیَةَ لَعَلَّنا نُصَلّی لِرَبِّنَا اللَّیْلَةَ وَنَدْعُوهُ وَنَسْتَغْفِرَهُ، فَهُوَ یَعْلَمُ اَنّی قَدْ کُنْتُ اُحِبُّ الصَّلاةَ لَهُ وَتِلاوَةَ کِتابِهِ وَکَثْرَةَ الدُّعاءِ وَالاِسْتِغْفارِ»؛ (تاریخ طبری، ج۷، ص۳۱۶؛ موسوعۃ کلمات الامام الحسینؑ، حدیث ۳۹۲، ح۳۷۹)۔

"جاؤ اور ان لوگوں سے کہو کہ اگر ممکن ہو تو جنگ کو کل پر ملتوی کریں تاکہ ہم لوگ آج کی رات نماز و تلاوت میں بسر کر سکیں اور اپنے رب سے استغفار و مناجات کر سکیں کیونکہ خدا جانتا ہے کہ مجھے نماز، تلاوت قرآن، استغفار اور مناجات سے شدید انس و لگاؤ ہے۔

حضرت عباسؑ دوبارہ گئے اور امام کا پیغام ان لوگوں کو دیا جس پر انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے مہلت دے دی"۔

مہلت کے مقاصد

رہتی دنیا تک کے لئے یہ پیغام دینا تھا کہ حسینؑ جنگ نہیں چاہتے حتی الامکان جنگ سے گریز کر رہے ہیں اور دوسری طرف بڑھتی ہوئی فوجیں وہ بھی عصر کے وقت اس بات کی عکاسی کر رہی ہیں کہ دشمن ہر طرح کے حربہ استعمال کر سکتا ہے وہ ظلم ڈھانے میں کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔

بڑھتی ہوئی فوج کو یہ کہہ کر روکنا کہ ہم عبادت کریں گے، نماز و تلاوت و دعا و استغفار کریں گے۔ امام عالی مقام کی طرف سے اعلان ہے کہ ہم کسی بھی دنیوی مقصد کے لئے نہیں نکلے ہیں اگر مقصد حصول دنیا ہوتا تو تیاریاں جنگ کی ہوتیں لیکن مصلائے عبادت دراز کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ

رضائے پروردگار کی سعی ہے ۔جس کی عصر عاشور ببانگ دہل منادی دی گئی.

"یا أَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ- ارْجِعِي إِلی رَبِّکِ راضِیَةً مَرْضِیَّة". (سورہ فجر،آیہ ۲۸،۲۷) کی شکل میں۔ جو خود معراج بندگی کی سند اور رضائے الہیٰ کا اقرار تھا۔

تاریخ نویسوں کو یہ پیغام دیا کہ جب بھی کربلا کی تاریخ لکھیں یہ ضرور لکھیں کہ یزیدی جنگ کے لئے کوشاں تھے اور حسینیؑ رضائے الہیٰ کے لئے وہ جنگ چاہتے تھے اور یہ امن کے خواہاں تھے۔

اس ایک شب کی مہلت سے نماز وتلاوت قرآن اور دعا و مناجات کی اہمیت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ چیزیں امام کے نزدیک کتنی اہمیت و عظّت کی حامل تھیں اسی لئے مہلت مانگی۔

انقلاب حسینی کا مقصد ہی یہی تھا کہ نماز و قرآن کو نئی زندگی ملے شعار الہی میں تبدیلی نہ آنے پائے پژمردہ ہو چکی شریعت میں حیات تازہ آئے اور عبادت الہی کی اہمیت پھر سے ظاہر ہو جائے اور بعد والوں کے لئے مشعل راہ ہو سکے اسی لئے ہم امام کی زیارت میں یہ جملہ پڑھتے ہیں:

« اشهد انک قد اقمت الصلاة»؛ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے نماز کو قائم کیا۔ (زیارت وارثہ)۔

یہی مقصد تھا کہ اگر اب تک کسی کو قیام حسینی اور انقلاب سید الشہداء کی اہمیت اور ضرورت نہ سمجھ میں آئی ہو تو اب آجائے کہ جو امام نے پہلے دن فرمایا تھا کہ میرے قیام کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ میں سیرت محمد مصطفیؐ اور سیرت علی مرتضیٰؑ کو زندہ کرنے کے لئے نکلا ہوں ۔ یہ اس کی تصدیق و تائید ہے۔

مہلت کی حکمتیں

ایک طرف عبادت الہی مقصد اصلی تھا جس میں خود امام حسینؑ سے لے کر تمام اعزاء واقرباء و برادر و اصحاب و انصار یہاں تک کہ خواتین و بچے بھی شامل تھے وہیں کچھ دوسرے اہم نکات بھی واضح کرنا تھے۔ جو اس سے پہلے ممکن نہ تھا گویا آتی ہوئی موت کو امام نے کچھ دیر کے لئے روکا اور سب پر واضح کر دیا کہ یہ زندگی کی آخری شام ہے۔

یقینی موت

امام معصومؑ اور آپ کے اعزاء تو علم امامت اور اپنی بصیرت کی وجہ سے یقینی موت کا علم رکھتے تھے لیکن دوسروں کے لئے ، ساتھیوں کے لئے اور بعد کے قلمکاروں کے لئے اور یزید سے ہمدردی رکھنے والوں کے لئے بات بنانے کا موقع تھا کہ اصحاب حسینی کا کمال کیا وہ تو اتفاقی حملہ اور جنگ کی وجہ سے شہید ہو گئے۔

دوسری طرف امام کو بھی حجت تمام کرنا تھی کیونکہ اب تک دوسروں کے لئے ایک امکان تھا کہ شاید جنگ نہ ہو، شاید کوئی راستہ نکلے، لیکن نویں محرم کو عصر کے وقت یزیدی فوج کی غیر متوقع پیش قدمی نے سارے امکانا اور قیاس آرائیوں کو ختم کر کے جنگ و شہادت کو یقینی بنادیا۔ اب امام کے لئے حجت تمام کرنا اور اپنے جانثاروں کے کمال اطاعت کو پوری دنیا پر اجاگر کرنا تھا۔ جو اس سے پہلے ممکن نہ تھا دوسری طرف تاریخی بہانوں کو بھی ختم کرنا تھا۔ اور عبادت کی اہمیت، کردار کی بلندی، عظمت نماز، شان تلاوت قرآن، معراج بندگی، اطاعت امام اور الٰہی مقصد میں ڈٹے رہنے والوں کی کامیابی کی شب تھی۔

اصحاب پر حجت تمام کرنا

جب سب کو معلوم ہو گیا کہ موت یقینی ہے پھر بھی اصحاب حسینؑ نے امام کی ہمراہی میں مصلائے عبادت بچھا کر عبادت شروع کی اس وقت امام نے تاریخی خطبہ دیا۔ جس میں خدا کی حمد و ثناء کے بعد خاندان رسالت اور مرکز نبوت ہونے پر اللہ کا شکر ادا کیا پھر فرمایا:

"میں نے اپنے اصحاب سے بہتر اصحاب نہیں دیکھے اور اپنے خانوادہ سے زیادہ با وفا و ہمدرد گھرانہ میری نظر سے نہیں گزرا خدا تم سب کو جزائے خیر دے مجھے میرے نانا نے خبر دی ہے کہ میں کربلا اور عمورہ نامی جگہ پر شہید کیا جاؤں گا میری شہادت کا وقت آچکا ہے کل ہی دشمن آغاز جنگ کریں گے تم آزاد ہو تاریکی شب میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لو اور چلے جاؤ کیونکہ لشکر یزید کو صرف مجھ سے سروکار ہے اگر تم نے میری حمایت سے ہاتھ روک لیا تو پھر انہیں تم سے کوئی غرض نہ ہو گی۔ خدا تم سب کو جزائے خیر عطا فرمائے گا۔"

اس موقع پر حضرت نے صاف اور واضح الفاظ میں اپنی شہادت کی خبر دی اور سب کو جانے کا آخری موقع بھی دیا یعنی اپنی بیعت بھی سب سے اٹھا کر سب کو آزاد کر دیا لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ حضرت کے بیان کے بعد چھوڑ کر جانے کے بجائے سب نے پھر پور طریقہ سے اظہار عقیدت کیا اور آپ کے بغیر زندگی کو ننگ و عار سے تعبیر کیا اور اصحاب و اقرباء کے ہر فرد نے پامردی و بہادری کے ساتھ حضرت کو اپنی وفاداری، جذبۂ نصرت، پائیداری اور استقامت کا یقین دیالا۔

اس موقع پر ہم کچھ جانثاروں کے بیان کو پیش کر رہے ہیں

حضرت عباسؑ کا بیان

"**لا ارنا اللہ ذلک ابدا**" میرے سید و سردار خدا وہ دن نہ دکھائے کہ ہم آپ کو تنہا چھوڑ کر کسی شہر کی طرف چلے جائیں۔ علمدار حسینؑ کے بعد بنی ہاشم کے

ایک ایک فرد نے اپنے عقیدہ کا اظہار اسی طرح کیا اور آخری دم تک حمایت کا یقین دلایا (صحیفۂ شہادت، ص ۱۴۷)۔

جناب مسلم کے بھائیوں کو بھی امام نے آزادی دے دی اور کہا کہ مسلم کی شہادت کافی ہے تم تو چلے جاؤ لیکن وہ بھی امام کی حمایت سے دستبردار نہیں ہو ئے۔

جناب مسلم بن عوسجہ کا بیان

آقا کیونکر ممکن ہے کہ ہم آپؑ کی نصرت سے ہاتھ روک لیں تو خدا کو کیا جواب دیں گے خدا کی قسم آپ کے قدموں سے جدا نہیں ہوں گے جب تک اپنے نیزوں سے آپ کے دشمنوں کا سینہ چھلنی نہ کردیں اور اپنی تلواروں سے ان پر ٹوٹ نہ پڑیں اگر ہمارے پاس نیزہ و شمشیر نہ بھی ہو تو ہم پتھروں سے جنگ کرتے ہوئے جان کا نذرانہ حضرت احدیت کی خدمت میں پیش کردیتے (صحیفۂ شہادت، ص ۱۴۸)۔

سعد بن عبداللہ نے یوں کہا

آپ کی نصرت و حمایت سے دست بردار نہیں ہوں گا آپ کی نصرت کر کے خداوند عالم کی بارگاہ میں کہہ سکتا ہوں کہ تیرے نبی کے حق کا خیال رکھا خدا کی قسم اگر ستر بار قتل کیا جاؤں اور پھر زندہ کیا جاؤں تب بھی آپ کی نصرت سے منہ نہیں موڑ سکتا (صحیفۂ شہادت، ص ۱۴۸)۔

اس طرح تقاریر کا سلسلہ جاری رہا اور ہر ایک نے فرداً فرداً اپنی حمایت اور جانثاری کا اظہار برملا کیا۔ جو شب عاشور کی خصوصیت تھی۔ جیسے جیسے موت قریب ہو رہی تھی جوش شہادت اور ولولہ نصرت امام میں اضافہ ہو رہا تھا۔

آخر کلام

ان تاریخی اقرار اور جذبۂ جانثاری نے اصحاب حسینیؑ کی عظمتوں میں چار چاند لگا دئے امام نے یہاں تک کہ بیعت بھی اٹھالی اور سب کو آزاد بھی کر دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی مورخ لکھ دے کہ یہ بیعت کر چکے تھے اس لئے مجبور تھے ساتھ دینے کے لئے جیسا کہ اب تک تاریخ میں یہ کئی بار ہو چکا تھا جب جناسیدہ نے مولائے کائنات کے حق کا دفاع کرتے ہوئے ایک ایک کے گھر جا کر حق کہنے کی بات کہی تو سب نے یہی کہا کہ ہم کیا کریں مجبور ہیں بیعت کر چکے ہیں۔ تو بیعت کو مجبوری بنا کر ہر موقع پر امت کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔ لہٰذا امام حسینؑ نے اس خود ساختہ مجبوری کو بھی ختم کرتے ہوئے بیعت بھی اٹھالی۔ اور دعا خیر کے ساتھ اجازت بھی دے دی۔ لیکن ان صاحبان بصیرت اور سچے حسینی جانثاروں نے امام کو چھوڑ کر جانا کسی بھی حال میں قبول نہ کیا اور آزادانہ طور پر فخریہ شان سے شہادت قبول کی۔

یہ شب عاشور کی حکمتیں اور مقاصد تھے جو قیام حسینیؑ کے کمال کو روشن کر رہے ہیں اور یہ بتا رہے ہیں کہ وہ کچھ بھی اتفاقی یا حادثاتی نہیں تھا بلکہ سب کچھ علم و اختیار کے ساتھ تھا اور کمال تھا کہ موت کے یقین کے بعد بھی جان بچانے کا خیال کسی کو بھی نہ تھا بلکہ سب صرف امامت کی اطاعت اور خدا کی بندگی میں مصروف تھے۔

ان تمام باتوں کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ شب عاشور کی مہلت جان بچانے کے لئے نہیں تھی بلکہ اپنے مقصد اور مشن کو نکھارنے اور اپنے جانثاروں کے کمال کردار اور اخلاص عمل کا برملا اعلان تھا۔

خداوند عالم ہم سب کو جذبۂ اصحاب حسینیؑ عطا فرمائے اور ہمیں امام کے سچے اور پکے پیروکاروں میں ہونے کی توفیق عنایت فرمائے۔

(آمین)

گریہ کرنے والوں کی منزلت

امام سجادؑ فرماتے ہیں:

«جو مومن امام حسینؑ کی شہادت پر آنسو بہائے کہ اس طرح کہ اس کے رخسار تر ہو جائیں تو خداوند عالم اس کے لئے بہشت کے درجات کو مخصوص قرار دے گا جس میں وہ ہزاروں سال رہے گا اور اسی طرح ہمارے دشمنوں کی طرف سے ہم پر ڈھائے گئے مصائب پر اس طرح روئے کہ آنسو رخسار سے نیچے آجائیں تو خداوند عالم اسے منزل صدق (بہشت کے بلند ترین مقام) میں ٹھہرائے گا».

(اللہوف، ص۹)۔

آئینۂ کربلا میں خوبصورتی کی علامات

• تحریر: سیدہ نہاں خاتون نقوی۔ طالبہ جامعۃ المصطفیٰ (ص) العالمیہ۔ قم

مقدمہ

کربلا والوں کے کلام و جملات میں عاشورا کی بعد ایک اہم جملہ حضرت زینب سلام اللہ علیہا کا جملہ ہے جسے اکثر بیان کیا جاتا ہے کہ جب ابن زیاد نے بازار کوفہ میں تمام جسارتوں کے ساتھ یہ جسارت کی اور طنزیہ طور پر کہا کہ دیکھا تمہارے خدا نے تم لوگوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟

تو حضرت زینبؑ نے فرمایا:

«مَا رَأَيْتُ إِلَّا جَمِيلاً» میں خداوند عالم کی طرف سے اچھائی و خوبصورتی کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا ہے (بحار الانوار، ج ۴۵، ص ۱۱۶)۔

اسلام کی اس بزرگ خاتون نے معرفت نظری (خداوند و نظام کائنات پر نگاہ کرنے کے زاویہ) کا ایسا باب کھول دیا جہاں بڑے بڑے مفکرین حیران ہیں کہ ام المصائب نے کیسے ابن زیاد کو ایک مختصر سے جملے میں لاجواب کر دیا اور باطل افکار و نظریوں کو خاک میں ملا کر اپنے سچے اور حقیقی عقیدے کو ظاہر کر دیا اور بیان فرما دیا کہ "عظمت نگاہوں میں ہوتی ہے نہ کہ اس میں جس چیز کو آپ دیکھ رہے ہیں" ۔

اور اسی طرح ثابت کر دیا کہ "کبھی کبھی خوبصورتی انسان کی نگاہ و دید میں ہوتی ہے نہ کہ نظاروں میں"۔

جو شخص خداوند عالم کے بہترین نظام کائنات پر نگاہ رکھتا ہے اس کی نگاہوں سے بہت سی چیزیں دکھائی دیتی ہے اور وہ بھی خوبصورت اور بہترین شکل میں۔ بس ضرورت ہوتی ہے کہ کیسا عینک آنکھ پر لگاتے ہیں اور کس زاویہ سے کائنات و واقعات پر نگاہ رکھتے ہیں۔

کائنات و زندگانی کو خوبصورت دیکھنا روح اور ضمیر کو بھی آرام و اطمینان بخشتا ہے اور انسان کے وجود میں طاقت ، لچک اور تحمل پیدا کرتا ہے، اسی طرح پریشانیوں کو برداشت کرنے کی قدرت عطا کرنا ہے۔اس نگاہ سے جیسا کہ جناب زینبؑ نے فرمایا عاشورا سوائے خوبصورتی کے کچھ نہ تھا۔

جناب زینبؑ نے کربلا کے واقعات سے متعلق دشمن کے طنز و طعنوں کے جواب اپنی زبان سے «مَا رَأَيْتُ إِلَّا جَمِيلاً» کا جو جملہ فرمایا تھا، وہ امام حسینؑ کی مہم ترین آرزو تھی جس کا آپ نے اس سفر کے آغاز میں اظہار فرمایا تھا: "لأرجو أن يكون خيرا ما أراد الله بنا قتلنا أم ظفرنا" یعنی امید کرتا ہوں کہ اس سفر میں

جو بھی پیش آئے گا وہ میرے اور میرے ساتھیوں کے لئے خداوند عالم کے ارادے سے خیر و بھلائی والا ہوگا چاہے کامیابی اور فتح کی صورت یا شہادت کی شکل میں (اعیان الشیعہ، ج ا، ص ۵۹۷)۔

واقعہ کربلا کو بھائی کا "خیر" دیکھنا اور بہن کا "خوبصورت" دیکھنا ایک دوسرے کی بات کو کامل کرتا ہے، آیئے آئینہ کربلا میں خوبصورتی کی ان بعض علامتوں اور نشانیوں کا دیکھتے ہیں جن کے بارے میں شاید جناب زینبؑ نے اسیری کی حالت میں اشارہ فرمایا ہے:

کمال آدمیت کی تجلی:

انسان کس حد تک بلندی تک پہونچتا ہے اور خدائی رنگ و روپ اپناتا ہے اور اس کی ذات میں فنا ہو جاتا ہے یہ بات "میدان عمل" میں ظاہر ہوتی ہے، کربلانے ہمیں دکھایا کہ انسان کی بلندی کی اونچائی، رفعت روح کی دہلیز، وجود کی بزرگی، کمال طلبی و کمال جوئی کس حد تک ہے۔ کربلانے ہی بتایا کہ آدمیت کا مقام کس حد تک ہوتا ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جو طالبان ارزش کے لئے خوبصورت بھی ہے اور معیار۔

مرضی الٰہی پر رضامندی کی تجلی:

عرفان اور روحانی سفر کرکے خداوندعالم کی رضایت حاصل کرنے کی منزل تک پہونچنا بہت سخت اور مہم ہوتا ہے، اگر حضرت زینبؑ، کربلا کے حادثہ کو خوبصورت بیان فرماتی ہیں تو یہ بات آپ کے اور امام حسینؑ کے ساتھیوں اور رشتہ داروں کے بلند روحانی اور عرفانی مقام و منزلت کو بتاتی ہے۔

واقعا حسینؑ ابن علیؑ اور حضرت زینبؑ، خداوند عالم کے ایک سچے عاشق کی مانند جس چیز کو معشوق پسند کرتا ہے انہیں بھی وہی پسند ہے۔اس لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ کربلا در اصل مرضی الٰہی پر رضامندی کی تجلی گاہ ہے، امام حسینؑ اپنے آخری لمحات میں یہی جملات گنگنا رہے تھے: "إلهی رضی بقضائک" خدایا میں تیری مرضی پر راضی ہوں۔ اسی طرح رخصتی پر اپنی بہن سے بھی فرمایا: "ارضی بقضاء اللہ" اے بہن خداوندعالم کی رضایت و خوشنودی پر راضی رہنا۔

یہ عرفان و بلند روحانی مقام ہے کہ انسان خود کو کچھ نہ سمجھے اور خدا کے علاوہ کسی کو بھی نظر میں رکھے، خدا کی مرضی کے سامنے کسی چیز کو پسند نہ کرے، کربلا کے سفر کے آغاز میں جب امام حسینؑ مکہ سے کوفہ کی طرف حرکت میں تھے تو ایک خطبہ کے دوران فرمایا: "رضا اللہ رضانا اهل البیت" خداوندا! اہم اہلبیتؑ وہی پسند کرتے ہیں جو تو پسند کرتا ہے (موسوعہ کلمات امام حسینؑ، ص ۳۲۸، فارسی)۔

راہ خدا میں امام حسینؑ کی جانبازی اور عشق تھا جس کو عزیز و محترم خاتون حضرت زینب سلام اللہ علیہا

خوبصورت گردانتی ہیں اور اس منطق و فکر کی تعریف فرماتی ہیں۔

حق و باطل کی پہچان:

عاشورا کی مہم ترین خوبصورت علامتوں میں سے ایک حق اور باطل میں جدائی پیدا کرنا اور "منافقین" اور فرشتہ صفت انسانوں کے میدان عمل کو واضح کرنا ہے۔

جب اچھائی اور برائی، حق اور باطل اس طرح گل مل جائے کہ باطل کا اندھیرا حق کو دھندلا ہو جاتا ہے اور حق مبہم نظر آنے لگ جاتا ہے تو اس طرح کی تاریکی میں انسانوں اور فکروں کی گمراہی طبیعی ہوتی ہے اور نقاب دار کفر سادہ لوح اور سطحی نگاہ رکھنے والے مسلمانوں کے درمیان شبہات پیدا کرتا ہے۔

ایسے ماحول و حالات میں امام حسینؑ کے کام کی خوبصورتی یہ تھی کہ آپ نے ایک عظیم چراغ و مشعل کو روشن فرمایا جس سے راستہ روشن ہو جائے، اندھیرے چھٹ جائے، منافقت والے چہرے بے نقاب ہو جائے، فتنے اور جھوٹ نمایاں ہو جائے اور لوگ پہچان لیں اور فریب و نقاب کا اثر ختم ہو جائے۔ اس سے بڑی خوبصورتی کیا ہو سکتی ہے؟

عاشورا ایک لائن و حد فاصل تھا، ایسی لائن جس نے حق اور باطل کو جدا کر دیا، حقیقی مسلمانوں کو دعویدار اور ڈھونگی مسلمانوں سے جدا کر دیا، رحمان و شیطان کے پیروکاروں نگاہوں کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا۔ حق واضح ہو کر باطل کے سامنے آگیا، باطل کے مزدوروں نے کربلا میں "یَا خَیْلَ اللهِ ارْکَبِی وبالجنه ابشری" کا نعرہ لگا۔ یعنی ابن زیاد نے اپنے ساتھیوں سے کہا: اے خدا کے فوجیوں! سوار ہو جاؤ، میں تمہیں جنت کی بشارت دیتا ہوں (بلاذری، احمد بن یحییٰ؛ انساب الاشراف، ص ۱۸۴)۔ باطل کے ایسے دھندلے سایہ کو حضرت امام حسینؑ نے اپنی شہادت سے مٹا کر رکھ دیا اور حق کی معرفت و شناخت میں جو تھوڑی کمی بھی رہ گئی تو اس کو شام و کوفہ میں حضرت سید سجادؑ و زینبؑ و ام کلثومؑ نے اپنے خطبوں اور بیانات سے واضح و روشن کر دیا۔ واقعہ کربلا کی یہ اہم ترین خوبصورتی تھی جس کا آج تک مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

خالص و حقیقی کامیابی:

کربلا و عاشوراء کی خوبصورتیوں میں ایک خوبصورت "جیت و کامیابی" کا جدید مفہوم پیش کرنا ہے، بعض لوگ غلط سوچ کی بنا پر سوچتے ہیں کہ کامیابی اور جیت صرف لشکری غلبہ پیدا کرنے کا نام ہے اور مظلومیت اور شہادت کو شکست سمجھتے ہیں۔ لیکن عاشورا نے دکھا دیا کہ مظلومیت کی انتہا میں بھی فاتح بنا جا سکتا ہے۔ قتل ہو کر بھی کامیابی کی کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ خون سے بھی فتح کا پرچم لہرایا جا سکتا

ہے۔ فاتح کربلا امام حسینؑ ہوئے اور یہ کتنی خوبصورت فتح تھی!

یہ وہی "شمشیر پر خون کی کامیابی" ہے کہ جس کے بارے میں امام خمینی رح نے بھی اسی مکتب حسینی سے درس لیتے ہوئے فرمایا کہ: جس قوم کے لئے شہادت ہی سعادت و خوشی ہے وہ ہمیشہ پیروز و کامیاب ہے... ہم چاہے قتل ہوں یا قتل کریں دونوں صورتوں میں کامیاب ہیں (صحیفہ نور، ج ۱۳، ص ۶۵)۔

خالص و حقیقی کامیابی کی یہ پہچان قرآنی تعلیمات "احدی الحسنیین" (توبہ، آیت ۵۲) کی بناپر ہے جو خدا کی راہ میں مقابلہ کرنے والوں کے بیان ہوئی ہے۔ جس نے اپنے فریضہ پر عمل کیا ہو وہ ہر حال میں کامیاب ہے اور وہ بھی حقیقی و خالص کامیاب۔

امام حسینؑ بھی قرآن کے اسی نظریہ پر عمل پیرا تھے، امام سجّادؑ اور حضرت زینبؑ بھی۔ اس نگاہ سے کربلا اور بعد کے تمام واقعات سے چونکہ اسلام و حق کو فائدہ پہونچ رہا تھا، لہٰذا ان حضرات کے لئے جمیل و خوبصورت تھے، جب حضرت امام سجادؑ سے ابراہیم ابن طلحہ نامی شخص نے پوچھا کہ کون کامیاب ہوا؟ تو آپ نے فرمایا: جب نماز کا وقت ہو اور اذان و اقامت کہا جائے تو سمجھ جاؤ گے کہ کون کامیاب ہوا ہے (امالی شیخ طوسی، ص ۶۶)۔

مشیت و راہ خدا میں حرکت:

خوبصورت ترین نشانی و جلوہ یہ ہے کہ انسان کے ایک عمل و حادثہ کا بستر مشیت و خواست خداوند عالم ہو، اگر شہیدوں کے سردار امام حسینؑ اور آپ کے ساتھیوں نے شہادت کو گلے لگایا، اور حضرت زینبؑ اور آل مصطفیؐ نے اسیری کو قبول کیا تو یہ سب مشیت خداوند کی تختی پر لکھا جاچکا تھا، اور اس سے بڑھ کر کیا خوبصورتی ہے کہ انسانوں کے کام مشیت الٰہی کے جدول کے مطابق ہوں؟

کیا امام حسینؑ کو غیبی خطاب نہ تھا کہ "إِنَّ اللهَ قَدْ شَاءَ أَنْ يَرَاكَ قَتِيلاً"؛ اے حسینؑ! خداوند چاہتا ہے کہ تجھے اس کے دین کی زندگی کے لئے اس کی راہ میں مقتول دیکھے۔ اسی طرح "إِنَّ اللَّهَ قَدْ شَاءَ أَنْ يَرَاهُنَّ سَبَايَا»؛" خداوند چاہتا ہے کہ عصمت و طہارت والی خواتین کو اسلام کی حفاظت کے لئے سر برہنہ پھرایا جائے۔ پس انہیں کیا افسوس ہوگا اُس شہادت سے اور اِس اسارت سے؟

دین و حق کی بقا اور طاغوت و باطل کی نقاب کشی کے لئے شہادت و اسارت دونوں ہی کا تو فدیہ دینا ہی تھا، وہ بھی عاشقانہ وار، صبر و بہادری کے ساتھ۔

دامن وحی کی پرورش یافتہ اور مکتب علیؑ میں پروان چڑھنے والی زینب کبریٰ کے لئے یہ حرکت مشیت الٰہی کے بستر پر تھی، اسی میں اقدار کی بلند و خوبصورتی تھی۔ آپ شروع سے آخر تک حرکت کربلا کے تمام

مراحل کو خوبصورت جانتی ہیں، اس لئے کہ آپ تمام مناظر کو اپنے پروردگار کی چاہت و مشیت کے مطابق جانتی ہیں۔

عاشورا کی شب قدر:

عاشورا کی وہ عظیم و قدر والی شب، کربلا کی روشن ترین خوبصورتیوں میں سے ہے۔ جو لوگ راہ فرار اور ٹھہرنے میں سے وفاداری اور ایثار کی نشانی یعنی امام حسینؑ کے ساتھ ٹھہرنے کو انتخاب کرتے ہیں اور حسینؑ کے بغیر زندگی کو ذلت اور موت سمجھتے ہیں، اور امام حسینؑ کے شب عاشورا کے خطبہ کے جواب میں وفاداری کا اعلان کرتے ہیں، اسی طرح جناب قاسمؑ سے امامؑ کا سوال اور آپ کا جواب، صبح تک اصحاب حسینیؑ کی شب بیداری، خیموں سے تلاوت قرآن و دعاؤں کی صدائیں، چاہنے والوں کا حضرت زینب کبریٰؑ کی خدمت میں اعلان وفاداری کرنا... یہ سب ہر ایک کتاب کربلا کی خوبصورتی کے زرّین باب ہیں۔ اس کے بعد کیوں حضرت زینبؑ کربلا و عاشورا کو خوبصورت نہ دیکھیں؟

جو کچھ کربلا میں رونما ہوا وہ پوری تاریخ اور دنیا کے ہر مقام پر ظلم و ستم سے مقابلہ کرنے کے لئے ایک بنیاد میں تبدیل ہوگیا، کیا یہ خوبصورت نہیں ہے؟

دھیرے دھیرے عاشورا ایک مکتب کی شکل میں سامنے آگیا جس نے انسان کو "آزادگی"، "وفا"، "جوانمردی"، "ایمان"، "شجاعت"، "شہادت طلبی"، "بصیرت" سکھایا، کیا یہ خوبصورت نہیں ہے؟

صحرائے کربلا میں بہنے والا پاکیزہ خون ایک سیلاب بن گیا اور اس نے ستم کی بنیاد کو ویران کر دیا، کیا یہ خوبصورت نہیں ہے؟

ایک فارسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

هر بساطی را که عمری شامیان گسترده بود

نیم روزی این حسین بن علی برچید و رفت

جو چادر شامیوں نے ایک عمر میں پھیلائی تھی؛ حسینؑ ابن علیؑ نے اسے آدھے دن میں لپیٹ دیا۔

کوفہ و شام کے مصیبت ایجاد کرنے والے فکر کر رہے تھے کہ حق والوں کے قتل عام سے اپنے آپ کو جاویدان بنالیں گے، لیکن حضرت زینبؑ کی گہری و دقیق نگاہوں وہ اپنی ہی قبر کھود رہے تھے۔

اہل بیتؑ کا نورانی چہرہ اور روشن و واضح ہوگیا اور ان کا نام و نشان جاویدان بن گیا، خدا کا دین زندہ ہوگیا۔ کربلا ایک علمی و اخلاقی و فقہی وعلوم انسانی کی عظیم درس گاہ بن گئی۔

حضرت زینبؑ کی عارفانہ نگاہیں یہ جانتی تھیں اور صدیوں بعد تک کو دیکھ رہی تھی اور کوفہ کے گورنر

کے طعنوں کے جواب میں فرمایا: "مَا رَأَیْتُ إِلَّا جَمِیلاً" میں نے اپنے بھائی اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ جو کچھ خداوند عالم کی طرف سے ہوا ہے اس کو خوبصورتی کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا۔

آخر مصائب امام پر گریہ کیوں؟

یہاں پر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ جب کربلا کے تمام واقعات حضرت زینبؑ کی نظر پر خوبصورت و جمیل تھے تو امام حسینؑ اور آپ کے ساتھیوں کی شہادت، مظالم و مصائب اور اسی طرح اسیران کربلا کے مصائب پر گریہ کیوں کیا جاتا ہے؟

جواب:

علماء بیان فرماتے ہیں کہ کربلا کے واقعہ میں تین طرح کے چہرے تھے اور انہیں تینوں چہروں کی کارکردگی اور ان کی طرف سے انجام پانے والے کاموں کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کربلا کے واقعات اور حادثات میں کونسی باتیں خوبصورت ہیں جن کی طرف جناب زینب سلام اللہ علیہا نے اشارہ فرمایا ہے اور کیوں کربلا کا واقعہ گریہ اور عزاداری کا باعث ہے۔

یہاں کربلا کے تینوں چہروں اور ان کی طرف سے انجام پانے والے کاموں کے بارے میں مختصر اشارہ کر کے اصلی سوال کا جواب پیش ہے:

تقدیر الٰہی اور حسینیؑ کردار

مختصراً امام حسینؑ اور آپ کے تمام ساتھیوں نے کربلا میں جو کچھ بھی کیا ہے وہ خوبصورت ہی خوبصورت ہے، کہیں بھی ایسی وفاداری، قربانی، عبادت، بندگی، شکر گزاری، استقامت، حفاظت دینا.... وغیرہ کی مثالیں نہیں ملتی ہیں۔ خدا کے امتحان میں امام حسینؑ اور آپ کے ساتھیوں نے جو کامیابی حاصل کی اور کربلا کے صفحات پر اپنے کردار کے جو جلوے بکھیرے ہیں وہ آج بہت زیادہ روشن ہوتے جارہے ہیں۔ کیا یہ خوبصورت نہیں ہے؟

اور اس کے بدلے میں خدا نے کربلا والوں کے لئے جو تقدیر لکھی ہے اور عظیم انعام واکرام عطا کیے ہیں اس کی مثال انسانیت میں کہیں نہیں ملتی ہے۔ خدا وندعالم کی طرف سے ملنی والی رضایت، محبت، عنایت، عزت، بزرگی، شہرت، حیات جاویدانی، شفاعت، عظیم مقامات کسے نصیب ہوئے ہیں؟ کیا خدا کی پورا کیا ہوا وعدہ خوبصورت نہیں ہے؟ کیا خدا کی عنایت و محبت خوبصورت نہیں ہے؟

گذشتہ بحث میں ان مطالب کو بیان کیا جاچکا ہے لہٰذا یہاں صرف مختصر طور پر اصلی سوال کا جواب پیش ہے۔

مظالم کی انتہا

دنیائے انسانیت میں بنی امیہ کے پست و بدترین کاموں کی مثالیں نہیں ملتی ہیں، امام اور آپ کے

ساتھیوں کو شہید کرنا بہت آسان طریقہ سے بھی ممکن تھا لیکن انہوں نے جنایتوں اور مظالم کے لئے جو طریقے اپنائے ہیں اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ امام سجادؑ ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ :

اگر میرے نانا رسولؐ بھی سفارش کرتے کہ میرے اہل بیتؑ کو مودت کے بجائے اذیت کرو تو بھی ممکن نہیں تھا کہ جتنی اذیتیں کربلا کے واقعہ میں دی گئی ہیں، اس سے زیادہ دی جاسکے "۔ یعنی ظالموں نے صد در صد مظالم و مصائب و تکلیفیں پہونچائیں۔ ان کے کام برائی، پستی کی انتہا تھے، کربلا والوں پر ہمارا گریہ اور ان کے لئے عزاداری اسی لئے ہے کہ دشمنوں نے واقعہ کربلا میں برے کاموں کو نہایت برائی سے انجام دیئے تھے، مظالم و مصائب میں ظلم و مصیبت کی انتہا کردی تھی۔ یزیدیوں کے انہیں کاموں اور مصائب و مظالم پر عزاداری ہوتی ہے اور جن لوگوں نے امام حسینؑ اور آپ کے ساتھیوں پر مظالم کئے خداوند عالم کی لعنت و عذاب کے حقدار ہیں، ہم لوگ بھی ان سے دوری اختیار کرتے ہیں، ان سے تبری کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے کربلا کی دردناک داستان کو سنا اور یزیدیوں کے کاموں پر راضی رہا، قیامت تک ایسے لوگوں پر خدا، رسولؐ اور ان کے دوستوں کی لعنت ہے۔

دوستی اہل بیتؑ کے بارے میں سوال

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: «وَقِفُوهُمْ إِنَّهُمْ مَسْؤُلُونَ»؛ اور ان کو ٹھیرائے رکھو کہ ان سے (کچھ) پوچھنا ہے (سورہ صافات، ۲۴)؛ "انہیں ٹھہراؤ، ان سے سوال کرنا ہیں"۔

امام حسن مجتبیٰؑ اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ :

"بیشک قیامت کے دن کوئی بھی بندہ ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتا ہے جب اس سے چار سوالوں کے بارے میں پوچھ تاج نہ کر لی جائے گی۔ اور وہ چار سوالات یہ ہیں: (۱) جوانی کے بارے میں کہ اسے کہاں تمام کیا ہے؟، (۲) عمر کے بارے میں کہ اسے کن کاموں میں لگایا ہے؟، (۳) مال و دولت کے بارے میں کہ انہیں کیسے جمع کیا اور کن چیزوں میں استعمال کیا ہے؟، (۴) ہم اہل بیتؑ اور خاندان پیغمبرؐ کی دوستی کے بارے میں۔ (بحار الانوار، ج ۴۴، ص ۱۲-۱۳)۔

حضرت امام حسینؑ کی نگاہ میں:

کربلا میں ظلم و تشدد کی جڑیں

• تحریر: مولانا محمد علی۔ طالب علم جامعۃ المصطفیٰ(ص) العالمیہ۔ قم

مقدمہ

دل کا مرنا اور پاک خدائی فطرت پر پردہ پڑ جانا اور حق کی طرف لگاؤ نہ ہونا، خدا کے دوستوں سے دشمنی و عناد کرنا؛ حرام خوری کے نتائج میں سے ہیں اور یہی حرام خوری ہے جو ظلم و ستم کے لئے آمادہ کرنے میں بہت ہی موثر ہوتی ہے اور کربلا بھی اسی وجہ سے رونما ہوئی ہے چونکہ دشمنان دین، دشمنان حسینؑ حرام خوری کے عادی تھے اور حرام مال و دولت کے حصول کا لالچ رکھتے تھے۔

اسلام میں عبادت کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ حرام خوری سے پرہیز کرنا اور پاکدامنی کا بزرگ ترین عبادتوں میں شمار ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں حرام خوری بہت بڑے گناہوں میں شامل ہے۔ چنانچہ امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں: "خداوند عالم کے نزدیک پیٹ کو حرام سے محفوظ رکھنے اور پاک دامنی سے بڑھ کر عبادت نہیں ہے۔" (وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۱۹۷، باب ۲۲)۔

مناسب ہے کہ یہاں حرام خوری سے مربوط چند نکات کو پیش کرنے کے بعد کربلا میں ہونے والے ظلم و تشدد میں حرام خوری کے آثار کو خود حضرت امام حسینؑ کی نگاہ سے جاننے کی کوشش کرتے ہیں:

حرام خوری کے آثار:

یہاں حرام خوری چاہے مال حرام کھانا ہو، یا مال ظاہرا حلال ہو مگر حرام طریقہ سے حاصل کرکے استفادہ کرنا ہو یا کھانے کے علاوہ دوسرے امور جیسے سکونت، بدن کے لئے استعمال وغیرہ میں ہو، ہر طرح سے حرام خوری کے زمرہ میں آتا ہے اور ان کے بہت ہی برے آثار بیان ہوئے ہیں، یہاں ان میں سے چند کو بیان کیا جارہا ہے:

۱۔ لعنت کے مستحق قرار پانا: متعدد آیات و روایات میں اس بات کا ذکر آیا ہے کہ حرام خوری، لقمہ حرام خدا اور فرشتوں کی لعنت کا سبب بنتا ہے، چنانچہ رسول اکرمؐ فرماتے ہیں: "جب بندہ کے پیٹ میں حرام لقمہ جاتا ہے تو زمین و آسمان کے تمام فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں" (کتاب الدعوات، ص ۲۵) اور

روایت میں ہے کہ جب تک حرام لقمہ بندہ کے پیٹ میں رہتا ہے خداوند عالم اس پر اپنی نگاہ نہیں کرتا ہے اور خدا کے غضب کا شکار ہوتا ہے مگر یہ کہ وہ توبہ کرلے۔ (روضۃ الواعظین، ج۲، ص۴۵۷)۔

۲۔اعمال کا قبول نہ ہونا: نبی اکرمؐ فرماتے ہیں: "حرام خوری کے ساتھ عبادت کرنا، ریت و بالو پر گھر بنانے جیسا ہے۔" (عدۃ الداعی، ص ۱۵۳)۔ اسی طرح آیا ہے: "ایک حرام لقمہ کی وجہ سے چالیس دن تک نہ نماز اور نہ روزہ قبول ہوتا ہے۔" (بحار الانوار، ج۶۳، ص۳۱۴)۔

۳۔ نیک اعمال کے انجام دینے میں دشواری پیدا ہونا اور قیامت میں ان کا تباہ و برباد ہونا۔

۴۔ مال سے برکت کا اٹھ جانا، مال کا ناحق اور غلط راہ میں خرچ ہونا۔

۵۔قساوت قلبی: حرام خوری کے اہم آثار میں سے دل کا سخت ہوجانا اور حق کی بات کو قبول نہ کرنا ہے۔

حرام خوری کے مصادیق:

مال حرام و حرام خوری چاہے بذات خود حرام ہو جیسے کتا، سور، مٹی کا کھانا وغیرہ۔ یا کسی صفت و خاصیت کی وجہ سے حرام ہو جیسے شراب خوری؛ مستی و نشہ کی وجہ سے، زہر آلود کھانا۔ یا مال یا چیز کو غیر شرعی طریقہ سے حاصل کیا گیا ہو جیسے : چوری کا مال وغیرہ۔ یا کوئی اور شکل ہو ہر لحاظ سے حرام خوری میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہاں حرام خوری کے چند مصادیق پیش کرتے ہیں جن کو دینی و فقہی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے :

۱۔ خداو معصومینؑ کے مال میں ناحق تصرف کرنا جیسے بغیر خمس نکالے ہوئے مال کا استعمال کرنا۔

۲۔ یتیم کے مال کا کھانا، جس کو قرآن نے ۷ بزرگ گناہوں میں شمار کیا ہے اور اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھرنے سے تعبیر فرمایا ہے۔ (سورہ نساء، آیت ۴ و ۱۰)۔

۳۔ دوسروں کی ملکیت و زمین کو زبردستی اپنے قبضہ میں کرنا۔

۴۔ سود خوری، جس کو قرآن نے خدا سے جنگ کرنے جیسا بتایا ہے۔ (سورہ بقرہ، آیت ۲۸۹)۔

۵۔ رشوت خوری۔

۶۔ قمار بازی کا مال؛ قرآن نے اس کو شیطان کا عمل اور انسانوں میں دشمنی کا سبب بتایا ہے (سورہ مائدہ، آیت ۹۰)۔

۷۔ غیر شرعی دعاؤں اور تعویذوں کے لکھنے کی اجرت، یہ معاشرے کے مختلف افراد کے لئے مضر و اختلاف کا باعث بھی ہوتے ہیں۔

۸۔نوکروں اور مزدوروں کی اجرت روک لینا اور خود کھا جانا؛ جس کے بارے میں خداوند عالم نے فرمایا

کہ میں خود ایسے ظالموں سے مواخذہ کروں گا (صحیح بخاری، ۴۳۸)۔

۹۔ غیر شرعی طور پر فقیری کر کے مال کھانا، یعنی بغیر ضرورت و حاجت کے مال مانگ کر کھانا۔

۱۰۔ چوری کا مال کھانا۔

۱۱۔ ناحق طریقہ سے کسی کی میراث ہڑپ لینا۔

۱۲۔ حرام معاملہ سے حاصل کیا ہوا مال۔

۱۳۔ زبردستی و نارضایت والے معاملے سے حاصل مال۔

۱۴۔ حرام مشغلوں اور کاموں سے حاصل مال وغیرہ۔

انسان کو حرام خوری سے پرہیز کرنا چاہئے اور ہر خدانخواستہ حرام خوری میں مبتلا ہوں تو اس سے توبہ کرنا چاہئے اور اس کے جبران کی کوشش کریں، مثلا نبی اکرمؐ فرماتے ہیں: ایک دانگ (چھٹے حصے) بھر مال حرام کا اصلی مالک کے پاس دوبارہ پلٹانا خداوند عالم کے نزدیک ۷۰ ہزار مقبول حج کے برابر ہے۔ (جامع الاخبار، ص۱۵۷)

امام حسینؑ کی نظر میں حرام خوری کے آثار:

جیسا کہ بیان کیا جاچکا کہ ظلم و ستم کرنا؛ حرام خوری کے اثرات و نتائج میں سے ہے، امام حسینؑ نے کربلا کے سفر چاہے ابتدا ہو یا آخر۔ بنی امیہ اور یزیدیوں کے مظالم کی وجوہات اور جڑوں کو بھی لوگوں کے سامنے پیش فرمایا ہے۔

حرام خوری سے انسان کی شناخت و معرفت کی حسّ چلی جاتی ہے اور شناخت اور حقیقتوں کو درک کرنے میں ناکامی حاصل ہوتی ہے، قرآن کریم اور معصومینؑ کی باتوں میں اس مطلب کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور اسے "دل پر تالا لگ جانے" جیسے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ ایسے انسان باطل پر اصرار کرتے ہیں اور حق کے مقابلے میں ہٹ دھرمی دکھاتے ہیں اور ظلم و ستم، کفر و نفاق کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ چنانچہ امام حسینؑ عاشورا کے دن چاروں طرف سے گھیرے ہوئے لشکر کے درمیان کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا تھا، اس میں فرماتے ہیں: "جو شخص میری اطاعت کرے گا وہ ہدایت یافتہ لوگوں میں سے ہوجائے گا اور جو میرے مخالفت کرے گا وہ نابود ہونے والوں میں سے ہوگا لیکن تم سب لوگ میری مخالفت ہی کروگے اور میری بات کو نہیں سنوگے؛ اس لئے کہ تمہارے پیٹ حرام سے بھرے ہوئے ہیں اور تمہارے دلوں پر تالا لگا ہوا ہے۔ لعنت ہو تم سب پر! کیوں خاموش نہیں ہوتے ہو، کیوں میری بات کو نہیں سنتے ہو؟" (بحار الانوار، ج۴۵، ص۸)۔

حق کی فراموشی اور محرمات الٰہی سے بے توجہی

کربلا میں مظالم و تشدد کے اہم ترین عامل جو انسانیت کے تمام انحرافات کی بھی جڑ ہے ان میں "حق کو فراموش کرنا" اور "خداوند عالم سے غافل ہونا"

ہے اور محرمات الٰہی کے سلسلے میں بے توجہی بھی شامل ہے۔

خدا کی یاد تمام سعادت و کمال و برکت کا سرچشمہ ہوتی ہے ،انسان جب خدا کی یاد میں ہوتا ہے تو خدائی عظمت و کمال و خوبصورتی کے عظیم و نامحدود سمندر سے قطرے کی مانند متصل ہوتا ہے ۔اپنے وجود کے تنگ حصار سے خارج ہوکر نور کی بے انتہا فضا میں پرواز کرتا ہے اور "خدا سے غفلت " کی حالت میں انسان پانی کی ایک چھوٹی سی جھیل کی مانند ہوتا ہے جو حیات کے اصلی چشمہ سے جدا ہوجائے اور فاسد ہونے سے بدبو دینا شروع کردیتی ہے۔

وہ روح و جان جو خدا کی یاد سے خالی ہوتی ہے وہ شیطان کے لئے بہترین چراگاہ بن جاتی ہے اور اس کے ساتھیوں کے حملوں کا میدان ہوجاتی ہے، ایسے زمین میں گناہ اور خطاکاری کے بیج بہت جلدی جلدی پھلتے پھولتے ہیں اور چند ہی دنوں میں انسان شیطان کی چال کا اسیر وغلام بن جاتا ہے اور اس کے گروہ میں شامل ہوجاتا ہے۔

امام حسینؑ دشمنوں کے لشکر کے سامنے خطبہ کے ضمن میں فرماتے ہیں: "بیشک شیطان تم پر مسلط ہوگیا ہے اور خدا کی یاد کو تمہارے ذہنوں سے بھلا دیا ہے۔" (بحار الانوار، ج ۴۵، ص۵)۔ امامؑ کے کلام کا یہ مضمون خدائی کلام کی عکاسی کررہا ہے جہاں پروردگار فرماتا ہے:

"شیطان نے ان کو قابو میں کرلیا ہے اور خدا کی یاد ان سے بھلادی ہے۔ یہ (جماعت) شیطان کا لشکر ہے اور یاد رکھو شیطان کا لشکر نقصان اٹھانے والا ہے، جو لوگ خدا اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کرتے ہیں وہ نہایت ذلیل ہوں گے۔ خدا کا حکم ناطق ہے کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب رہیں گے۔ بے شک خدا زورآور (اور) زبردست ہے۔" (سورہ مجادلہ، آیت ۱۹تا ۲۱)

اور یزیدیوں کے مقابلے میں وہ حسینؑ والے تھے جن کے شکم، جن کے دل و دماغ پاکیزہ تھے اور امام کی نصرف کے ہر لحاظ سے آمادہ تھے ، خدا و رسول و امام پر کامل ایمان رکھتے تھے۔ ان جیسوں کے بارے میں اسی سورہ مجادلہ کی آخری آیت ہے جس میں پروردگار فرماتا ہے:

"جو لوگ خدا پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تم ان کو خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے۔ خواہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا خاندان ہی کے لوگ ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان (پتھر پر لکیر کی طرح) تحریر کردیا ہے اور فیض غیبی سے ان کی مدد کی ہے اور وہ ان کو بہشتوں میں جن کے تلے نہریں بہہ

رہی ہیں داخل کرے گا، ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ خدا ان سے خوش اور وہ خدا سے خوش۔ یہی گروہ خدا کا لشکر ہے۔ (اور) یاد رکھو کہ خدا ہی کا لشکر مراد حاصل کرنے والا ہے۔" (سورہ مجادلہ، آیت ۲۲)

امام حسینؑ کی باتیں تمام صدیوں کی پشت سے تمام انسانوں کے لئے پیغام ہے اور حقیقی کامیابی کی چابی ہے اور انحرافات، تعصّبات اور گناہوں کی تیز تلواروں کے مقابلے میں تنہا سپر و ڈھال ہیں، ہم خدا کی یاد پر توجہ رکھیں، ہمیشہ خدا کو یاد رکھیں اور اللہ کے لشکر میں شامل رہیں نہ کہ شیطان کے لشکریوں میں قرار پائیں۔

والسلام

ہر روز زیارت امام حسینؑ

حضرت صادقؑ اپنے صحابی سے فرماتے ہیں:

"اے سدیر! کیا تم پر یہ حق نہیں بنتا کہ تم قبر امام حسینؑ کی ہر جمعہ پانچ مرتبہ اور ہر روز ایک مرتبہ زیارت کرو؟

سدیر بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: مولاؑ میں آپ پر قربان! میرے اور قبر امام حسینؑ کے درمیان میلوں کا فاصلہ ہے اور ہر روز زیارت کیسے ممکن ہے؟

حضرتؑ نے ارشاد فرمایا: اپنے گھر کی چھت پر جاؤ اور پھر دائیں جانب اور بائیں طرف رُخ کرو اور اسکے بعد اپنے سر کو آسمان کی طرف بلند کرو اور اسکے بعد اپنے سر کو قبر امام حسینؑ کی طرف کرو اور پھر اس طرح کہو: "السَّلَامُ عَلَيْکَ يَا أَبَا عَبْدِ اللَّهِ السَّلَامُ عَلَيْکَ وَ رَحْمَةُ اللَّهِ وَ بَرَكَاتُهُ"؛

درود ہو آپ پر ابا عبداللہ! ۔آپ پر درود و رحمت و برکات خدا ہوں۔

جب بھی تم نے ایسا کیا تمہارے لئے ایک «زَورَہ» کا ثواب حساب کیا جائے گا. «زَورَہ» یعنی ایک حج اور ایک عمرہ۔ سدیر کہتے ہیں کہ اس کے بعد اکثر اوقات تو ایسا ہوتا تھا کہ میں دن میں اس طرح سے بیس مرتبہ حضرت امام حسینؑ کی زیارت کر لیا کرتا تھا (کامل الزیارات باب ۹۶)۔

کربلا شام و سحر جانے کو جی چاہتا ہے

▪ نتیجہ فکر: مولانا عرفانؔ عالم پوری صاحب

کربلا شام و سحر جانے کو جی چاہتا ہے
ہر عزادار کا گھر جانے کو جی چاہتا ہے

کربلا جائیں گے تو مار دیئے جائیں گے
ہے پتا ہم کو مگر جانے کو جی چاہتا ہے

دیکھ کے شہ کے عزادار کو بولی جنت
اب مرا اور سنور جانے کو جی چاہتا ہے

حُر کو آتا ہوا دیکھا تو کہا حوروں نے
اس کی راہوں میں بکھر جانے کو جی چاہتا ہے

دیکھا غازی کو تو بولا یہ خوشی سے میداں
اب مرا لاشوں سے بھر جانے کو جی چاہتا ہے

مَل لو چہرے پہ ذرا خاکِ درِ بنتِ رسولؐ
اے زلیخا جو نکھر جانے کو جی چاہتا ہے

ہم نے تو دیکھ لیا حسنِ علی اکبرؑ کو
اب نہ یوسفؑ ترے گھر جانے کو جی چاہتا

شیخ جی تم کہاں اور شہ کے عزادار کہاں
اِن کا ہر حد سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے

موت کے خوف سے تم چھوڑ کے میداں بھاگے
اور یہاں سولیوں پر جانے کو جی چاہتا ہے

جب سے جانا ہے کہ آتے ہیں لحد میں مولاؑ
ہے خوشی اِتنی کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

بیچ دریا میں سفینہ ہے مرا اے عرفانؔ
یا علیؑ کہہ کے اُتر جانے کو جی چاہتا ہے

ہر ایک سوال کا واضح جواب رکھتا ہے
ہٹا کہ راہ سے کانٹے گلاب رکھتا ہے
زمانے بھر میں اکیلا ہے کربلا کا سفر
قدم قدم پہ جو حج کا ثواب رکھتا ہے

ہاتھ کاٹے گئے گردنیں بھی کاٹی گئیں
آدمی پھر بھی شہ دیں کا عزادار بنا
ہر دفعہ توڑ دیا خون سے اپنے ہم نے
کربلا کے لئے قانون کئی بار بنا

نذرانہ عقیدت دربارۂ شہیدان کربلاؑ

- نتیجہ فکر: مولانا شفیع بناری صاحب

میرے قلم سے پہلے تو اللہ لکھا گیا
پھر اُس کے بعد میں نبی اللہ لکھا گیا

جب لکھ چکے دو نام تو محسوس یہ ہوا
آنکھیں ہیں بند فاطمہ زہراؑ لکھا گیا

آئی جو بات کس کی ولایت کا حکم ہے
بے فاصلہ غدیر کا مولا لکھا گیا

دستِ عطا سے جس نے عطا کر دیا مجھے
وہ نامِ حسنؑ ہے جو سنہرا لکھا گیا

لاکھوں شہادتیں ہوئیں اسلام کے لئے
لیکن حُسینؑ کو ہی شہنشاہؑ لکھا گیا

زینبؑ کے دونوں لاڈلوں کا مرتبہ ہے یہ
ان دونوں کا فرات پہ قبضہ لکھا گیا

تیرہ برس کی سن نے بتایا ہے ذائقہ
قاسمؑ سے موت کا ہی سلیقہ لکھا گیا

ہوگا ضرور اِس کا بھی کلمہ کہیں لکھا
اکبرؑ کو جب رسولؐ کا چہرہ لکھا گیا

دیکھا جو میں نے غور سے غازیؑ کے علم کو
غازیؑ کے علم پر ہی سکینہؑ لکھا گیا

کیوں رو رہی ہے موت تُو کرب و بلا میں اب
کیا چھ مہینے بچے کا ہنسنا لکھا گیا

دیکھا جو میں نے بھاگتی فوجوں کو با خدا
احساس میں حسینؑ کا حملہ لکھا گیا

جس کے سبب یزید بھی خاموش ہو گیا
بیمارِ کربلاؑ کا وہ جملہ لکھا گیا

جملہ یہی تھا کس کے ہیں دادا اذان میں
نا دے سکا جواب وہ گونگا لکھا گیا

میں لکھ رہا تھا بیٹھ کے ذلت یزید کی
زینبؑ ترا وہ شام کا خطبہ لکھا گیا

سارے طبیب لکھتے ہیں نسخے مریض کو
لیکن مرا وظیفہ عریضہ لکھا گیا

میرا نہیں ہے کوئی بھی ڈالر سے واسطہ
چلتا ہے جو رضاؑ کا وہ سکّہ لکھا گیا

کتاب اربعین

▪ نتیجہ فکر: مولانا حسن رضا صاحب

(۱)

منفرد ہر باب سے ہو کیوں نہ باب اربعین
ثانیٔ زہرا نے لکھی ہے کتاب اربعین

دشمنوں کی سازشوں کے سب اندھیرے چھٹ گئے
جب نکل آیا فلک پر آفتاب اربعین

اتحاد اور جذبہ ایثار کہتے ہیں کسے
دیکھنا ہو تو ذرا دیکھو نصاب اربعین

دشمنو! تم اس کی خوشبو کم نہیں کر پاوگے
کربلا کی خاک سے پھوٹا گلاب اربعین

داعشی سب چیخ اٹھے دیکھ کر جم غفیر
گویا بوڑھا کر گیا ان کو شباب اربعین

دشمنان دین حق بہہ جائینگے سیلاب میں
گر برس جائے کبھی ان پر سحاب اربعین

جس طرف اٹھی نظر بس ہر طرف تھا اضطراب
باعث تسکین تھا یہ اضطراب اربعین

دشمن حق چاہتا ہے کم کریں ! پر ہر برس
حق بڑھاتا جا رہا ہے آب و تاب اربعین

یوں چمکتے ہیں زمیں پر زائرانِ اربعین
جیسے تاروں سے بھرا ہو آسمانِ اربعین

یوں لگا جنت کی ہر نعمت ہے میرے واسطے
کربلا میں جب ہوا میں میہمانِ اربعین

ہے رضاؔ کی یہ دعا میرے خدا چمکے سدا
آسمان کربلا پر ماہتاب اربعین

(۲)

آنکھیں مری صدف ہیں تو گوہر غم حسینؑ
یہ مومنوں کے کعبہ دل میں مکین ہے
دنیا کے سب غموں سے ہے بڑھکر غم حسینؑ
تا حشر ہو نہ پائے گا بے گھر غم حسینؑ

بیٹے کو لیکے گود میں روتے ہیں مصطفیٰؐ
اشک عزا دکھایا تو فردوس مل گئی
یعنی منارہے ہیں پیمبرؐ غم حسینؑ
کام آگیا مجھے سر محشر غم حسینؑ

ان کو دعائے فاطمہ زہراؑ نہیں ملی
اپنے گلے سے تجھکو لگائے ہیں فاطمہؑ
جن لوگوں کو ہوا نہ میسر غم حسینؑ
اللہ رے یہ تیرا مقدر غم حسینؑ

دنیا میں کوئی نام نہ لیتا یزید کا
اشکوں کی بھیک آنکھ کے کاسے میں ڈال کر
سب کلمہ گو مناتے جو ملکر غم حسینؑ
صحرا کو کر رہا ہے سمندر غم حسینؑ

زیارت حسینیؑ کی راہ میں خرچ

حضرت امام صادقؑ نے فرمایا:

«مَن أنفَقَ دِرهَمًا فی سَبیلِ اللهِ وَلِزیارَةِ قَبرِ الحُسَینِ (علیه‌السلام)، کَتَبَ اللهُ لَهُ بِکُلِّ دِرهَمٍ مِائَةَ حَسَنَةٍ، وَحُطَّت عَنهُ مِائَةُ سَیِّئَةٍ، وَرُفِعَ لَهُ بِکُلِّ دِرهَمٍ دَرَجَةٌ فی الجَنَّةِ»

«جو کوئی راہِ خدا میں اور امام حسین علیہ السلام کی قبر کی زیارت کے لیے ایک درہم خرچ کرے تو خداوند متعال ہر درہم کے بدلے میں اس کے لیے سو نیکیاں لکھتا ہے، اس کے سو گناہ مٹا دیتا ہے اور ہر درہم کے بدلے میں اس کا جنت میں ایک درجہ بلند فرماتا ہے»۔

(کامل الزیارات، ص ۱۱۲)

بسم الله الرحمن الرحيم

Under the Patronage of Hazrat Wali al-Asr (aj)

Akhtar Taban

اختر تابان

AKHTAR TABAN BIMONTHLY RESEARCH JOURNAL
YEAR 2 | NO. 7 | JULY & AUGUST 2025

MAGAZINE PROFILE

- **Editor-in-Chief:**
  Hujjatul Islam
  Syed Kazim Rizvi
- **Executive Director:**
  Maulana
  Talim Raza Jafri
- **Deputy Executive Director:**
  Dr. Syed Baqir Eliya Rizvi
- **Graphics and Design:**
  Syed Rohullah Naqavi

Bonyad Akhtar Taban
Block 63, Alley 28, Safaiyah Street, Qom, Iran
+982537837506 | +989963778614
www.allamahrizvi.com
info@allamahrizvi.com

In the Name of Allah, the Most Gracious, the Most Merciful

How Imam Hasan and Imam Husayn (a.s) saved Islam from Destruction

Analysis by: Rais al-Muballigheen Allamah Sayyid Saeed Akhtar Rizvi
Preparation by: Hujjatul Islam Moulana Sayed kazim Rizvi

The relationship between religion and rulership is very delicate. Until the time rulers are content to follow the religion, it is all right. But when their aspirations exceed the limits and they aspire to also control religion and keep it under their subjugation, it is the beginning of strife and destruction. This is the time when the Genghis Khan gets the sword of religion in his hand. In such an event, it is only religion that has to bear the loss. For example, the acceptance of Christian religion by Emperor Constantine was more harmful to Christianity than open opposition of the previous irreligious kings.

Ideal Islamic State

Islam did not remain heedless of this peril and it had provided the cure right from the beginning. No Muslim had the right to make any kind of changes or distortions in the Islamic law. In an Islamic government there is nothing as "Law-making committee." The Almighty Allah, alone is the supreme authority and the sole lawmaker, whose laws have been conveyed to us through Prophet Muhammad (s.a.w). These laws are final and complete. They have solution of every imaginable problem and every possible condition. And if some problem requires elucidation or interpretation only those appointed for this by the Almighty are eligible to discharge this duty. These are the holy Imams, specified by Allah Almighty.

They are infallible and they have been appointed by Allah through His Prophet.

Because Islam continued to give a disciplined way of life and progressed during the lifetime of the Prophet and because all the departments of this Islamic state functioned under the divine guidance of the Holy Prophet, it was suitable, rather utmost necessary that after the passing away of the Holy Prophet (s.a.w) the reins of the kingdom should remain in the hands of those impeccable Imams who were the divine representatives after the Messenger of Allah (s.a.w), and who were appointed by Almighty Allah. This method would have saved Islam from distortion and would have established it on a firm foundation forever.

In this way Islam would have remained free from the claws of materialist proud rulers and it would have remained pure of the emotional ups and downs of the kings and Emirs and their unwarranted zeal and nuances.

This was the reason that the Holy Messenger declared, on the basis of the specific directions of the Almighty, that after him there would be twelve Imams, and he also informed that, "Of whosoever I am the master, this 'Ali is also his master." This step was taken so that Islamic Shariah may not be sacrificed at the altar of political intrigues.

However, some people, whose aspirations did not discriminate lawfulness and illegality, did not like this, and they deemed it such that rulership should not remain in the hands of 'Ali and his successors. In this way Islam was forever deprived of the security that was bestowed upon it by Allah.

As a result, Islam became a target of all those ills that had befallen the previous religions.

Why Islam became a target of destruction

It is very painful to write on this subject. However, if we are able to survey the past without any bias and bigotry it would be a very firm step for benefit of our future guidance. I have heard people expressing astonishment that how could a person like Yazid acquire the rulership of Islamic dominions? What created a favorable atmosphere for such an eventuality? Nothing in this world happens without a cause.

Those who were flowing in the current of the events may not have

realized the importance of each and every incident, but when we consider those events today, we can place each and every incident in a proper perspective. And our judgment would be more correct than the judgment of those who had practically acted in that drama.

The root cause of every calamity of the early history of Islam as we have stated above, was that Islam was deprived of the guidance of ʿAli and the Imams after him. This in itself was a great calamity. In addition to this those caliphs who occupied the seat of rulership derived full benefit of their temporal authority and they imposed the view on the public that religious leadership is subservient to temporal authority.

And whosoever succeeds in acquiring temporal authority (in whichever way) he would be considered a lawful caliph and religious guide. He also (as history witnessed) had the power to make changes and abrogation's in the Islamic Shariah. Due to this wrong notion people considered every act of the rulers as the criterion of religion. As a result of which there began decadence in following the Islamic law and Shariat.

Decadence of Islam

This decadence began soon after the passing away of the Messenger of Allah (s.a.w). Those who got the political power did not waste a moment in making it absolute and permanent. Therefore, naturally the laws of economy and justice were modified in such a way that they should serve the purpose.

The method of equal distribution of Sadaqah (Alms), Zakat (Poor Tax) and war booty was given up and a fixed amount as pension was awarded to the companions of the Prophet. This pension varied from two Dinars to a thousand Dinars. In this way, tongues were sealed of those who could have supported the opposition group. (Sharh Nahjul Balagha (Ibne Abil Hadid Mutazali), Vol. 1 , Pg. 133, Rauzatul Ahbab, Vol. 1, Pg. 410 and Vol. 2, Pg. 25).

On the other hand, steps were taken to weaken the economic condition of those from whom there was chance of danger. That is why clear disobedience was committed of the Islamic laws of inheritance and gifts in the case of Fatima Zahra, who was the daughter of the Holy Prophet and wife of ʿAli.

The land of Fadak gifted by the Holy Prophet to his daughter was

confiscated illegally. The first caliph claimed thus while Fadak was in the possession of Fatima. Thus, the first caliph was a plaintiff. According to universal law the burden of proof was on the caliph and not on Fatima. Instead, Fatima was asked to provide witnesses to prove her right. She presented witnesses but they rejected them on the pretext that they had personal interest in the property.

The caliph presented a solitary tradition, which was against the clear commandments of Qur'an and whose veracity could not be established by any companion at that time. In spite of this the verdict was based on this tradition. Also, since in this case the caliph was himself the plaintiff, legally and ethically he was not eligible to hear the case. But he did preside over the case. He delivered a verdict and declared that his claim was valid. In this way, through this extraordinary case, a new form was given to the Islamic Shariah and the rule of justice. (Futhuhul Bayan, al-Balazari, Pg. 42-43, Tarikh Khamis, Vol. 2, Tarikh Kamil of Ibne Athir, Vol. 2, Pg. 85, Tarikh Tabari, Vol. 3, Pg. 95-98, Sirah Ibne Hisham, Vol. 3, Pg. 408, Kitabul Imamah wal Siyasah, Ibn Qutaybah, Wafa al-Wafa, Vol. 2, Chapter 6, Marijun Nubuwwah, Rauzatul Auf Saheli, Vol. 2, Pg. 247, Tafsir Durre Manthur, Vol. 4, Pg. 177, Habibus Sayr, Part 1, Pg. 58, Insanul Uyoon, Vol. 3, Pg. 400, Balaghatun Nisa, (Sermons of Fatima Zahra).

Khums (20 percent tax) money, which was the right of Fatima, was also denied. Though it was the right given to her family by the Holy Qur'an. (Kanzul Ummal, Vol. 3, Pg. 129-135, Musnad Ahmad Hanbal, Vol. 1, Pg. 4, Al-Farooq, Allamah Shibli Nomani, Vol. 2, Pg. 117).

Here it would not be out of place to mention that during that same period a companion of the Prophet, Jabir Ibn Abdullah claimed that the Messenger of God had promised him some things. This claim of his was accepted without calling for proof and witnesses. Due to this policy, Fatima and her family members were even deprived of her personal heritage while those supported by the government managed to pile up huge wealth and properties. (Sahih Bukhari, Book of Khums, Sahih Muslim, Tabaqat Ibne Sa'ad).

A few examples of such machinations will suffice here:

When Abdur Rahman bin Auf (who was favored by all the first three caliphs) died, he left besides other things, four widows. Every widow

was entitled to receive 1/32 of the inheritance according to the Shariah. One of them was also in the waiting period (Iddah) of a revocable divorce. That is why she was compelled to accept less than what was her legal right. (This is another example of subverting the Islamic law). Thus, she received less than 1/32 part. In spite of this she was given a hundred thousand in cash.

Talha bin Ubaidullah (another favored one of the governments) had a fixed income of 2000 Dinars besides other incomes. When he died, he left behind 2200000 Dirhams and 2000000 Dinars in cash. Apart from this he had unspecified property worth millions.

At the time of his death, Zubair bin Awwam left 50000 Dinars, 1000 horses and hundreds of bonded servants. (Al-Istiab, Ibne Abde Barr, Vol. 2, Pg. 560, Vol. 1, Pg. 208 and 215, Politics in Islam, Khuda Bakhsh Khan, Pg. 151, Muruj az-Zahab, Masudi, Vol. 2, Pg. 222).

The Islamic emphasis against hoarding of wealth was disregarded. A new society was brought into shape in the Islamic world, which was exactly opposed to Islam in nature and character. However, the people considered it to be in consonance with Islam only because it was established by those who were considered to be the interpreters of Islam.

The Rise of the Umayyads

The most harmful feature for Islam was the resurgence of the Umayyads and their return to a position of power. They were the same Umayyads who were sworn enemies of Islam. This also materialized under the patronage of the caliphs. During the lifetime of the Messenger of Allah, the Umayyads waged battle after battle against Islam, under the leadership of Abu Sufyan.

At last, their power was destroyed in 8 A.H. when the Holy Prophet (s.a.w) conquered Mecca without any bloodshed or armed conflict. Now, since no other option remained, they changed their tactics. That is, now they donned the garb of Islam. However, Islam never reached their hearts and the blood of infidelity continued to flow in their veins. The Holy Qur'an has referred to them at least on six occasions, and in every place, they are denounced in the most humiliating manner. In the view of Qur'an, these people are "the accursed tree or family." (Tafsir Durre Manthur Suyuti. (Surah 17) Vol. 4, Pg. 191, and other

books of Qur'anic exegesis and traditions. Also refer to the chapter, "Bani Umayyah in the view of Qur'an).

Here it is worth quoting a tradition of Abdur Rahman bin Auf. He inquired from the second caliph regarding the following verse of the Holy Qur'an:

"Fight for Allah as is worthy of fighting."

The second caliph replied, "It shall be applicable to the time when the Banu Umayyah shall be the rulers and the Bani Mughaira shall be their ministers. At that time it would be the duty of Muslims to fight against them with all their might". (Tafsir Durre Manthur Suyuti Vol. 4, Pg. 371).

How astonishing was the miracle of human psychology! Who could believe that the same caliph who knew that it would be the duty of every Muslim to perform Jihad for the sake of Allah against the Banu Umayyah, should himself appoint them to the governorship of Syria (Shaam)? And that he should fashion the plot of the drama of Shura in such a way that an Umayyad becomes the absolute ruler of Muslims in the form of the third caliph! More surprising than this is that it is the same Abdur Rahman bin Auf who played a very important role in the appointment of the third caliph.

The Bani Umayyads remained absolutely silent in the last period of the Messenger of Allah (s.a.w). However, after the passing away of the Messenger they got an opportunity to flex their muscles. Abu Sufyan first of all, called upon His Eminence, 'Ali (a.s), but he refused to have any sort of cooperation from this well-known foe of Islam. After that Abu Sufyan went to the first caliph. If he had also rebuffed the offer of Abu Sufyan like 'Ali (a.s) there would not have been any problem. But under the advice of the second caliph, he was given the offer of Syria. At that time Abu Sufyan had already reached old age, so his son Yazid was sent with an army to Syria and after the conquest of Syria he was appointed as the governor of the province.

Then after the demise of Yazid, his brother, Muawiyah succeeded to the governorship of Syria. (Refer to my book of Islamic History).

How strange are the changing circumstances in politics! Who could have anticipated that the same Bani Umayyads who during the lifetime of the Messenger had continued to use all their power for the destruction of Islam should one day become the absolute authority of the Islamic

kingdom? They could not harm Islam in any way when they resorted to open enmity against it.

However, through internal conspiracy they nearly destroyed Islam. After the second caliph, Uthman became the third caliph. When people gave allegiance at the hands of Uthman, Abu Sufyan came to him and gave the following advice, "O sons of Umayyah! Now that you have obtained this kingdom, play with it like a child plays with a ball. And pass it among your family from one to another. Because this kingdom is a reality. As for Paradise and Hell, we don't know whether they exist or not". (Al-Istiab, Vol. 4, Pg. 76-77, Tarikh Abul Fida, Vol. 2, Pg. 61).

We do not know the response of the caliph to this statement but History indeed witnesses that this advice was put into effect in the best way possible.

The Holy Prophet (s.a.w) had banished Hakam bin Aas and his son, Marwan from Medina. He was the uncle of the third caliph and Marwan was his son-in-law. Therefore, he ignored the command of the Messenger of Allah (s.a.w). Not only did he recall Marwan to Medina but also appointed him as his absolute vizier. Not only the Khums money of Africa (which amounted to millions) was entrusted to him, but Fadak was also gifted to him. (We have already mentioned Khums and Fadak in the foregone pages). (Muruz az-Zahab, Vol. 2, Pg. 223, Kanzul Ummal, Vol. 6, Pg. 90, Tadkeratul Khawaasul Ummah, Pg. 134, Fathul Bari, Sharh Sahih Bukhari, Vol. 3, Pg. 141, Rauzatul Manazir, (published with Murujuz Zahab, Pg. 209).

Abdullah bin Abi Sarh was a relative of the caliph. On the day of the conquest of Mecca the Holy Prophet (s.a.w) had issued orders that he must be put to death even if he is found in the Holy Ka'ba. However, despite this fact, Uthman sheltered him in his house and obtained pardon for him after much petitioning. In the reign of Uthman, such a person was appointed as the governor of Egypt. (Al-Istiab, Pg. 393, Al-Isabah fi Marifatus Sahaba, Vol. 2, Pg. 316-317, Tafsir Durre Manthur, Vol. 3, Pg. 30).

Walid bin Uqbah was a cousin of the caliph. The Holy Qur'an refers to him as 'transgressor'. (Al-Isabah published with Al-Istiab, Vol. 3, Pg. 632, Lubabun Nuqool).

He was a drunkard and a man of very bad character. But he was appointed as the governor of Kufa. One day he came to the Mosque intoxicated and began to lead the Morning Prayer. Instead of the

prescribed two units he recited four. Then on top of that he turned to the people and asked, "If you like I can make you recite some more units"(Tafsir Nishapuri, Vol. 21, Pg. 72, Tafsir Durre Manthur, Vol. 5, Pg. 178, Tafsir Malimut Tanzil, Baghavi, Pg. 702, Tafsir Kashaf, Zamakhshari, Tarikhul Khulafa, Suyuti, Pg. 105, Tarikh Kamil, Ibne Athir, Vol. 3, Pg. 40, Tadkeratul Khawaasul Ummah Pg. 117, Sharh Fiqh Akbar, Pg. 92, Muruj az-Zahab, Vol. 1, Pg. 303, Sahih Muslim, Vol. 2, Pg. 72).

Not only the above three persons, everyone connected with the Banu Umayyah obtained an influential post. (Tarikhul Khulafa, Suyuti, Pg. 105, Tarikh Kamil, Ibne Athir, Vol. 3, Pg. 40, Spirit of Islam, Sayyid Amir 'Ali, Pg. 417-437).

These people utilized their power and position to weaken the Islamic society, to distort the Islamic ethics, to dishonor the principles and laws of Islam, to ridicule the worship acts and in other words to destroy each and everything related to Islam.

Within a period of less than 25 years after the Prophet of Islam (s.a.w), the standard of Islamic leadership became the lowest in the long history of the religions of the world. Generally, the Muslims instead of being the slaves of the Almighty became the servants of gold and silver (riches and wealth). The third caliph was murdered not because he was making the Bani Umayyads richer and richer and, in this process, distorting the principles of equitable distribution of wealth in Islam.

And also, not because he was making his kinsmen masters of the Muslim people, while in the view of the Qur'an they were from the accursed (family) tree. Rather it was due to the fact that all this was not liked by other great people of the Islamic world whom the caliph had ignored. They were of the view that they should also be accorded the opportunity to amass wealth. They would not have opposed the Bani Umayyads if they had also been allowed some share in that wealth.

His Eminence, 'Ali (a.s) wanted to save Islam

His Eminence, 'Ali (a.s) always endeavored to make the people realize what a terrible mistake they had committed by accepting others as their religious leaders. This mode of action was not for any selfish gain but for the sake of Islam which by being usurped by incapable characters was being necessarily becoming distorted. When after the second caliph, 'Ali (a.s) was offered the post of caliphate subject to the condition that he would continue

the practice of the former caliphs, he rejected the offer immediately. Because accepting this condition would have implied his approval to the illegal caliphates of the former caliphs.

After the third caliph when people petitioned him to accept the caliphate he agreed only with the condition that he would re-establish the Islam of the Prophet's time. He thought that he would have the opportunity to purify Islam from the innovations that had crept into it and distorted the pristine principles of faith. (Refer to Nahjul Balagha and its various commentaries).

However, the justice and equity of His Eminence, 'Ali (a.s) tasted bitter to the transformed Muslim leaders. They had become accustomed to preferential treatment. And they disliked that anybody should change the unjust system. If it were not true, what was the reason that Talha, Zubair and Ayesha raised the banner of revolt against His Eminence, 'Ali (a.s)? While during his brief reign he only tried to establish the system that existed in the Prophet's lifetime.

The view of the Muslims regarding the social principle had undergone such a change that they could not bear these corrective measures that he, 'Ali (a.s) had taken to reestablish them (Nahjul Balagha, Al-Istiab (Published with Al-Isabah) Vol. 3, Pg. 47, Tarikh Tamaddun Islami, Vol. 4, Pg. 37).

Battle after battle was waged against him. And ultimately, he was martyred in the Kufa mosque while he was praying. And in this way the Muslims lost the sole opportunity through which their society could have been reestablished on the ethical, social and economic justice of the Islamic principles.

Imam Hasan (a.s) stepped forward to help

Imam Hasan (a.s) (who was the divine representative after the martyrdom of his respected father), realized that the ailment of the Muslims has reached such a stage that no hope of cure remained. Dishonesty had become their faith, treason was their loyalty, and wealth their sole beloved and selfish gain their only aim. Now it was almost impossible that a divine government could be established among them.

Now the most important question before Imam Hasan (a.s) was how Islamic principles could be safeguarded? The former rulers had changed the faith in the superior authority of the Prophet into faith in the supreme authority of the rulers.

They had gained from this wrong belief and departed from the world, but they left behind Islam fraught with utter confusion and perplexity. To allow this wrong notion to continue was the greatest danger to Islam. Now, when it was no more possible to establish a divine government, the only option was to tell the people that worldly rulership and religious leadership were not same but different things. And that the responsibility of the defense of religion and its leadership is entrusted by Allah. It is not rulership, that is bestowed by people. The aim was that people should realize that religion is not tied to a crown and throne (kingship).

Religion is separated from leadership

After His Eminence, ʿAli (a.s), only Imam Hasan and Imam Husayn (a.s) could perform this function. They were having innumerable merits, not from the people and army but from the Almighty Allah. According to the statement of the Holy Qur'an, both of them were sons of the Messenger. Love and affection towards them were obligatory on the Muslims. They were purified of all defects and no error was possible from them. They were the chiefs of the youths of Paradise. Their obedience was incumbent upon the people because they were Imams, whether they be sitting or standing; that is whether they make peace or war.

The gist of the matter is that their authority was absolute in every circumstance, because their Imamate was not based on political power. Therefore, depending on the exigency they could reject rulership and also oppose the rulership of that time.

That is why the beloved sons of ʿAli and Fatima (a.s), with the absolute authority bestowed on them by Allah and the Messenger, chose such a way that the religion was forever emancipated from the terrible clutches of the despotic rulers. Firstly, Imam Hasan (a.s) abandoned political power and showed that his religious position and post was not needful of and dependent on temporal rulership.

The greatest benefit of this step of Imam Hasan (a.s) was that the point of view of the Muslim community regarding the connection between rulership and religious rulership began to undergo a change, as would become clear later on. Muawiyah tried his best to change many principles of Islam but he failed in his endeavor. If the same changes and innovations had

taken place during the time of the first three caliphs, the Muslim community would have accepted them as they accepted some other innovations.

However, now Imam Hasan (a.s) had entered the picture. And this wrong notion was destroyed that religion is the handiwork of rulership. That is why Muawiyah could not succeed much. Rather, today there are even some Sunni people who are not prepared to accept him as a caliph.

Evil deeds of Muawiyah

Now we should turn our attention towards Damascus. It was the time when Muawiyah was the accepted ruler of the Muslim populace. Not through selection or nomination but through force and armed conflict. We have already seen the atmosphere preceding it that every un-Islamic imagination or method was accepted as a part of Islam. The only condition was that the ruler in power must present it.

Muawiyah tried by all means to take advantage of this view. The power of money reached to the zenith. Poison, sword and gold were made use of to the optimum level to achieve the unjust aims of the tyrannical rulers. It became very common to kill the opponents, to martyr the opposite party by poison and treason, to imprison those whose loyalty was doubtful and to burn down their houses and property. Imam Hasan Ibn ʻAli (a.s) was martyred through poison. Hujr bin Adi and his companions were accorded security in the name of God but martyred in the cruellest manner. Malik Ibn Ashtar was martyred through poison.

Muhammad Ibn Abi Bakr (son of the first caliph) was put inside a donkey's skin and burnt to death. Ayesha (daughter of the first caliph and the wife of the Prophet) was killed by being pushed into a trench, which was later filled up with lime and she was left to perish in that hole. Khalid bin Walid's (whom the Sunnis call the sword of Allah) son, was killed by poison. Amr bin Hamaq, the respectable companion of the Messenger of Allah (s.a.w) was killed in an atrocious manner.

We have already discussed the beliefs of Abu Sufyan, and Muawiyah was not better than his father.

It is worth narrating the report of the trusted governor of Muawiyah here. Once he was having a conversation with Muawiyah. During the talk, Muawiyah said, "Why should I do good to the people? Even if I do

good how can I hope that I would be remembered with a good name? See, a person from Bani Teem (that is the first caliph) ruled over the people, and did many great things for them. But when he died his name also died with him.

Today people refer to him only as "Abu Bakr" and that's all. After that came a person from Bani Adi (that is the second caliph) and he ruled with absolute authority for ten years. But his name also ended with him. And now people refer to him most of the time as "Umar", and that's all. But look at Ibn Abi Kabasha (The infidels of Quraish used to refer to the Prophet with this derogatory title and Muawiyah is also using this epithet).

His name is called out five times every day and the Muezzin. (Caller of Azan). screams from every mosque, "I witness that Muhammad is the Messenger of Allah." Now after his success what else remains to be done and what good deed could be remembered?

Except for this open insult of the Messenger and Azan what else could be expected from an offspring of Abu Sufyan? In addition to political intrigue, misappropriation of trusts, dishonesty, barbarity and murder, he also tried to change the method of worship.

Examples of innovations are also found in the previous regimes. Caliph number two added: "As-Salaato Khairum min an-Nawm". (Prayer is better than sleeping) in the Morning Azan". (Call for Prayer) He also removed "Hayya Alaa Khairil Amalfrom (Prayer is the best of deeds) the Azan. He started conducting Tarawih prayers in congregation. Caliph number three added one more Azan before the Friday Prayer. And he also started the custom of sermon before the Eid Prayers.

He initiated the ritual of performing full prayer while on a journey though it was an established practice to recite two units instead of four during the time of the Messenger of Allah (s.a.w). But Muawiyah went most ahead of his predecessors. He omitted the recitation of Bismillah (In the name of Allah, the Beneficent, the Merciful.) from the chapters of Qur'an recited in the ritual prayers. Similar was the case with the utterance of 'Allaho Akbar' (Allah is the Greatest) before every action in prayer. He stopped this custom.

He recited the sermon of the Friday Prayer in seated position on the pulpit. When he was going to confront His Eminence, ʿAli (a.s), the caliph of the Messenger of Allah (s.a.w) he ordered his soldiers to recite the Friday Prayer on Wednesday itself. It is needless to say that people acted upon his instructions. During the Hajj, instead of jogging between the Safa and Marwah mountains, he rode on a horse. Even though no excuse existed for him to do so. He removed the "talbiyah" (Labbaik, Allahumma Labbaik) (Here I am, O Lord. Here I am) from the rituals of Hajj.

However, the most significant of these innovations is the joining of hands during Prayer. There are many historical proofs that show that it was only Muawiyah who had started this custom. Imam Malik (the founder of the Maliki sect) has commanded his followers to keep their hands open and straight during prayers. (As the Shias do). And he stated its reason was that the people of Medina used to keep their hands loose in prayers and the people of Medina had seen the Holy Prophet (s.a.w) praying.

Hence the method of the people of Medina must indeed be based on the emulation of the Messenger. Imam Malik died in 179 AH. In addition to his logic, we have the traditional reports of Abdullah bin Zubair, Ibn Sireen and other scholars of Islamic jurisprudence that prove that at least until the 2nd century of the Hijrah Calendar, the people of Medina did not join their hands during Prayer.

On the other hand, Imam Abu Hanifah and Imam Ahmad Hanbal (who were educated in Iraq and Syria where the influence of Banu Umayyah was more) have advised their followers to join their hands. And more interesting is the verdict of Imam Shafei (who initially lived in Mecca and Medina and later resided in Iraq and Egypt), who says that both options are permitted in Prayers.

Some proofs of innovation in Prayer are also found through two companions of the Prophet. Anas bin Malik (an aged companion of the Prophet) went to Damascus. He wept incessantly on whatever he witnessed there. He said, I don't see anything among you that I had witnessed in the time of the Prophet except this prayer and that is also transmogrified.

Another companion of the Messenger of Allah (s.a.w), Abu Darda said, "I don't find anything here in accordance with the religious law,

except that they perform the ritual prayers in congregation. Apart from this, everything has been abandoned.'' When His Eminence, ʿAli (a.s) was engaged in battle against Muawiyah, he said, ''We are fighting them so that the prayer may be established anew.''

Here it would be most appropriate to mention that when His Eminence, ʿAli (a.s) led the prayers in his caliphate, people became joyous and automatically exclaimed, ''This is how the Prophet prayed. We have witnessed this prayer after a long time.'' Among those who expressed such views are the notable names of Umar bin Hussayn, Abu Musa Ashari and Abu Huraira.

Muawiyah was the first person in Islam who not only took usury in trade, but he also made it permissible according to religious law. He openly indulged in wine, singing, music and dance, while all these things are clearly prohibited in Islam.

He initiated the cursing of the Prophet's cousin and his caliph, His Eminence, ʿAli (a.s), and this shameful practice continued among the Muslims until the end of the first century of the Hijrah. Here it is necessary to remind that His Eminence, ʿAli (a.s) is the one, love and respect towards whom is made obligatory on all Muslims through the command of the Qur'an and the instructions of the Messenger of Allah (s.a.w). Love for ʿAli is love for the Messenger, and enmity towards ʿAli is construed as enmity towards the Prophet. Peace and harmony with ʿAli (a.s) is peace and harmony with the Messenger of Allah (s.a.w). And discord with him is same as discord with the Prophet. Also, cursing ʿAli (a.s) is like cursing the Messenger of Allah (s.a.w).

Openly opposing the established principles of Qur'an and Islam, Muawiyah announced in the Friday sermon that all the income of the Islamic kingdom was his personal property and to distribute it among the Muslims or not rested upon his personal discretion. If he likes he may give something from it to whomsoever he likes, but if he does not, no one had any right to question him because it was his personal property.

These examples clearly show that Muawiyah not only tried to change the worship acts, he endeavored to make changes in every field of the Islamic law. If he was not able to succeed it was only because of the divine diplomacy of Imam Hasan (a.s).

Let me also mention that the diplomacy of Imam Hasan (a.s) also proved successful in the fact that through it, it became sufficiently easy to distinguish between a true believer and a hypocrite. During the lifetime of the respected father of Imam Hasan (a.s), in the last four years, all Muslims used to consider him as the ruler of the Muslim dominions. Among them were some who believed him to have been divinely appointed and the majority considered him to be the consensual caliph. The faith did not have any benefit from this milling crowd of people harboring different views as circumstances have shown clearly. The treaty of Imam Hasan (a.s) with Muawiyah removed all the misconceptions and only those true believers remained with Imam Hasan (a.s) whose faith could not change with the changing political scenario.

If one studies this much history of Muawiyah one would begin to wonder if more destruction of Islam was possible. But to say this would be premature because the curtain had not yet risen on the last act of this drama. The worst of Muawiyah's plots was appointing his son, Yazid as his successor. He tried all means to make his plan successful, through bribes as well as intimidation. By intrigue and by deception, by poisoning and by blatant murder.

A few years after this evil nomination, the ruler of Muslims, who called himself the Prophet's successor, departed from the world with the crucifix around his neck. Now Yazid was the absolute ruler of complete Islamic territories that spread upto Azerbaijan in the east to Yemen in the south and to Egypt in the west and Iran in the east.

Beliefs and acts of Yazid

What was the character of this so-called caliph of the Prophet?

He was such that he openly denied the messengership of the Messenger (s.a.w). He made his beliefs clear in the following couplets:

"Banu Hashim (the Prophet and his family) has played a game to obtain temporal power.

The fact is that neither an angel came to them nor any revelation descended."

Intoxicated in this wrong belief, he considers that the tussle between Islam and disbelief to be a battle between two clans and is overjoyed that he has succeeded in taking revenge from the progeny of the Prophet on behalf of his ancestors.

"If only my ancestors who died in Badr had been alive and seen how their opponents (Ahl al-Bayt of Prophet) were suppressed, they would have screamed in joy: O Yazid! May your hands never tire! We have killed their leader and, in this way, took revenge of Badr. And I won't be eligible to be called the descendant of the fighters of the Ditch (Khandaq) if I had failed to take revenge from Muhammad and his relatives."

This much is sufficient to learn about his true beliefs. Let us now see what he says regarding other pillars of Islamic faith:

Qiyamat (Day of Judgment)

"O my beloved! (Do not be sure of reunion after death) Because whatever you have heard of life after death is mere fiction which makes one heedless of the joys of this real world."

Wine and Worship

Your God has not said that Hell is for those who drink. Rather He has said that it is for those who pray."

Against the background of his misguided notions, it is also necessary that we study his evil feats.

In addition to the tragedy of Karbala' he committed so many atrocities in the history of humanity that each alone is sufficient to make him forever deserving to be cursed.

Here we shall present only two examples of his evil feats in which he was not successful but his aim became very much obvious. It was at the time when he was the heir apparent of Muawiyah.

First of all, he wanted to marry Ayesha, the widow of the Holy Prophet (s.a.w). At that time the age of Ayesha was more than fifty years. This desire only proves that all he wanted was to insult the Holy Prophet (s.a.w) and Holy Qur'an, because the Holy Qur'an has prohibited the Muslims to marry the wives of the Holy Prophet (s.a.w). Thus, Yazid also intended to insult the Muslims who considered the wives of the Prophet as the mothers of the believers.

Yazid had to give up the desire at the behest of his father, who was a cunning diplomat, and he knew that this blatant act would cause the loss of all opportunities of Yazid of ever becoming the Caliph.

Secondly, he tried to drink wine on the roof of the House of God, that is the Holy Ka'ba. On this occasion also he was restrained by his friends and advisers.

After gaining caliphate he began to openly ridicule the Islamic worship acts (as we have stated before). He dressed up dogs and monkeys in the attire of scholars and religious leaders. Chess and playing with bears were his favorite pastime. He used to spend all his time everywhere in drinking wine without any hesitation whatsoever. He had no respect for any woman. So much so that even the ladies among his blood relation, like the mother, sisters, paternal aunts, nieces and daughters were like other women for him.

Plunder of Medina

Yazid ordered attack on Medina and the holy town of the Messenger of Allah (s.a.w) was freely plundered. Three hundred virgins (along with other ladies) became the target of their lusts. Three hundred reciters of the Holy Qur'an and seven hundred companions of the Messenger were martyred mercilessly. The Holy Mosque of the Prophet remained shut for many days and Yazid's forces utilized it as a stable for their mounts, and dogs took shelter in it.

Even the holy pulpit of the Messenger did not remain safe from filth. At last, the commander of the forces compelled the people of Medina to pay allegiance to Yazid in the following words: "We are the slaves of Yazid. And it is upto him whether he restores our freedom or sells us in the slave market." Those who wanted to pledge allegiance for Yazid upon the condition that he would follow the Qur'an and the traditions of the Prophet were put to death. Here it would not be importunate to state that the Messenger of Allah (s.a.w) has said:

"Whoever terrifies the people of Medina shall be under divine curse forever."

Siege of Mecca

After this, under orders from Yazid, the army departed for Mecca and these people laid siege to the Holy City of God. This army could not enter the town so they used catapults and by this method rained stones and burning logs of wood on the Ka'ba. Kiswa, that is the cloth covering of the Ka'ba was burned down and a part of the Holy Ka'ba collapsed.

In this way we have reached such a time when everything connected to Islam, from the roots of religion to the sanctified worship acts, from family life to social system all were under attack and were being destroyed.

Through whom? Through Yazid who was supposed to be the protector and defender.

And the most important matter was that some of those innovations would indeed have been considered Islamic and made a part of Islam. Because since the last fifty years people had become accustomed to accept all that the ruler does as the true criteria of Islam. Today no sign would have remained of Islam if Imam Hasan (a.s) had not put a stop to this tendency and if Imam Husayn (a.s) had not openly opposed the reigning king (that is Yazid).

Calamities of Imam Husayn (a.s)

Neither anyone possessed such courage nor anyone had such love for Islam and neither did so much responsibility rest on anyone regarding Islam as it rested on Imam Husayn (a.s). Husayn was the son of the daughter of the Prophet. He was the beloved son of ʻAli and Fatima and the younger brother of Imam Hasan (a.s). He was the heir and successor to all of them. Islam was the religion that his grandfather had brought and established. Since the beginning this family was a staunch defender of Islam. The members of this family could offer any sacrifice for Islam. And many a times they sacrificed everything they possessed for Islam and even gave up their life and lives of their beloved ones. Imam Husayn (a.s) was used to sacrificing everything for the sake of Islam. He found Islam in peril and he rose up for its defense. He also saw that it was the best opportunity to present an effective and final sacrifice for Islam. So that it Maybe forever safe from danger. Therefore, he came to Karbala' along with some of his selected relatives and companions who did not exceed 150 persons including women and children. The whole world knows what happened at Karbala'. And how Imam Husayn (a.s) and his companions and relatives (including a six-month infant) tasted the cup of martyrdom on the 10th of Muharram 61 AH. How they bore the torture of thirst and hunger from the seventh to the tenth of Muharram. How their tents were burned down and how their household possessions plundered. How their ladies and ailing son and little children were made captives. And how they were presented in the courts of Ibn Ziyad and Yazid in Kufa and Damascus. How they underwent the tortures of

imprisonment for a full year. How they were released after that. All know these facts and therefore I need not go into the details here.

Imam Husayn (A.S) Gave the Final Shape to The Separation of Imamate and Rulership

Imam Husayn (a.s) was martyred and Yazid apparently seemed victorious; but only apparently. Actually, it was Husayn (a.s) who emerged a victor and he wrote the story of his success on the sands of Karbala' with his blood. There were many aspects of this success of his. However, I intend to discuss only one aspect over here. As we have seen before, Yazid was the absolute ruler of the Islamic kingdom. And according to the principles established by the previous three caliphs, each of his action was supposed to have been considered as the standard and criteria of religion.

Imam Husayn (a.s) had no such political certificate. But he was the only one who could confront Yazid (the reigning king) and not be called a rebel, because he possessed every certificate from God and the Prophet that his elder brother Imam Hasan (a.s) had received. And the tradition of the Messenger of Allah (s.a.w) that: 'Husayn is from me and I am from Husayn,' had clarified that every action of Husayn was same as that of the Holy Prophet (s.a.w).

Therefore, when people learnt about the tragedy of Karbala' they could not in any way believe that Husayn (a.s) would have been in the wrong. Because to say that Husayn was on the wrong was same as saying that the Holy Prophet (s.a.w) was on the wrong (God forbid), that is why Yazid (l.a.) became the target of cursing in the whole Islamic world.

In this way the task of separating religion and politics that was started during the time of Imam Hasan (a.s) reached completion at the martyrdom of Imam Husayn (a.s) and it was the link of the same chain. The peace treaty of Imam Hasan (a.s) and the battle of Imam Husayn (a.s) are complimentary to each other and it is not possible to understand them in isolation from each other.

It is mentioned in traditions that the upper portion of Imam Hasan's (a.s) body and the lower portion of Imam Husayn's (a.s) resembled that of the Messenger of Allah (s.a.w). Perhaps the Almighty Allah wanted to make it a sign that in order to

understand the true and correct religion of the Prophet, it is necessary to study the life of both the grandsons together. The two brothers together saved Islam from the willful deeds of the rulers.

Imam Husayn (a.s) turned the stream of the opinion of the people in the right direction. After the martyrdom of Imam Husayn (a.s) political power did not denote religious authority. After Karbala' the status of ruling kings did not remain such that their act should become a law of Islam. Anyone could become a king through nomination or consensus. Anyone could occupy the throne by force and compulsion. However, becoming the ruler of people was something else and being a religious leader is different. The former is appointed by the people and the latter by Almighty God. Imam Husayn (a.s) at last opened the eyes of the Islamic world forever.

Imam Hasan and Imam Husayn (a.s) saved Islam from the slavery of rulers and in this way saved it from decadence and destruction. And the names of Imam Hasan and Imam Husayn (a.s) shall also remain attached to Islam forever.

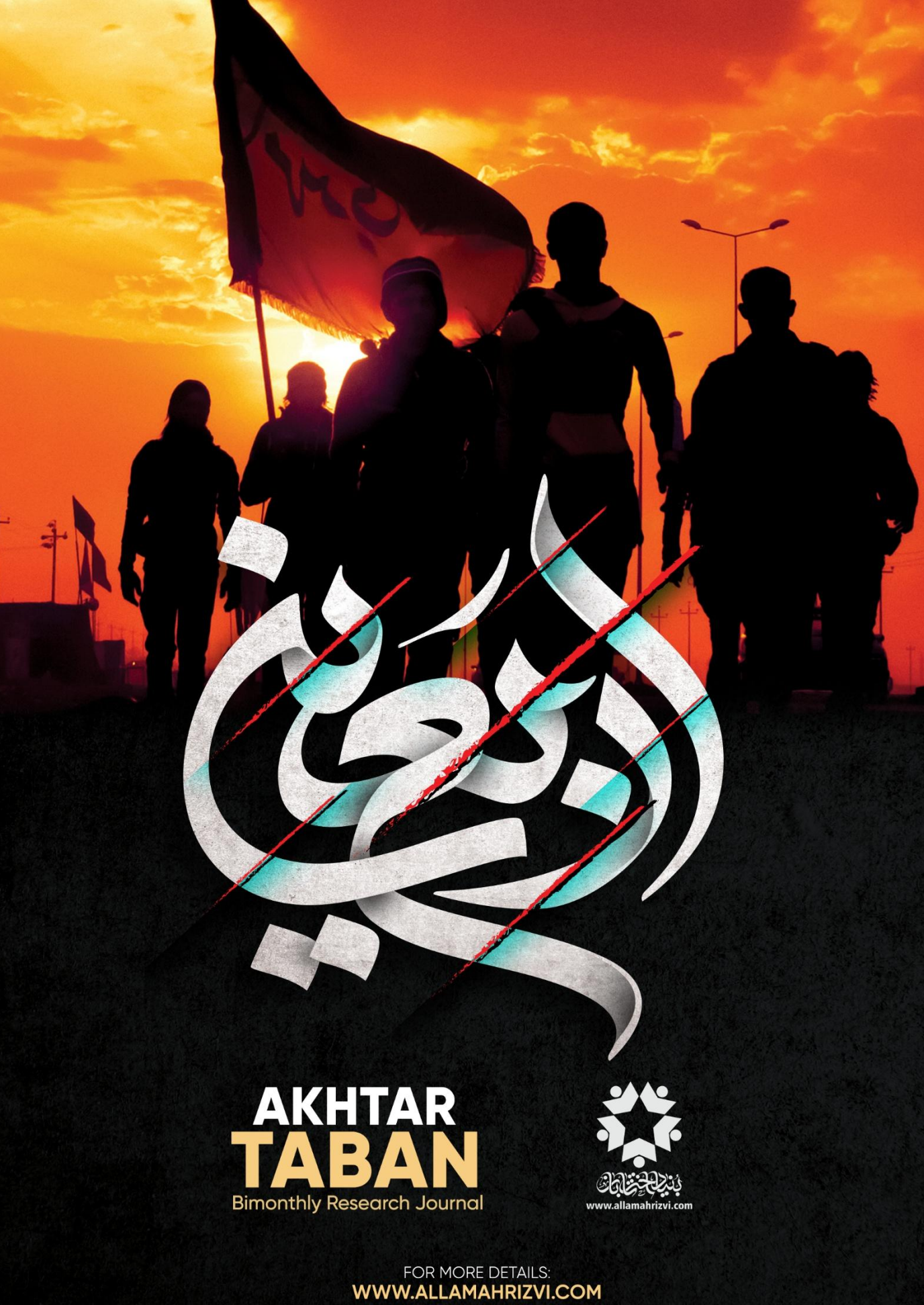

AKHTAR TABAN

Bimonthly Research Journal

بنیاد علمی اختر تابان

www.allamahrizvi.com

FOR MORE DETAILS:

WWW.ALLAMAHRIZVI.COM